

# تعلیمی مقالات

ڈاکٹر اصغر علی شیخ

ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ

محمود پرنٹنگ پریس لمیٹڈ
56 - این گلبرگ 2 ، لاہور

# تعلیمی مقالات

ڈاکٹر اصغر علی شیخ



شائع کردہ

ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ

اُردو بازار۔ لاہور (پاکستان)

بار : اول 1972
تعداد : 1000
قیمت : 9.00
مجلد : 12.00

پرنٹرز: محمود پرنٹنگ پریس لمیٹڈ
56۔ این گلبرگ 2، لاہور

بار : اول 1972
تعداد : 1000
قیمت : 9.00
مجلد : 12.00

پرنٹرز: محمود پرنٹنگ پریس لمیٹڈ
56 ۔ این گلبرگ 2 ، لاہور

# پیش لفظ

آردو زبان میں ''تعلیمی ادب'' کی حد درجہ کمی ہے ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تعلیمی ادب کی اصطلاح بھی آردو کے لیے نئی اور اجنبی معلوم ہوتی ہے ۔ اس مخصوص شعبہ علم سے تعلق رکھنے والے یا وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرین تعلیم ہیں جو اپنی تشنگی کا سامان انگریزی کتب سے مہیا کرتے ہیں یا زیر تربیت اساتذہ جن کی امتحانی ضروریات چند درسی کتابوں بلکہ بازاری خلاصوں سے پوری ہو جاتی ہیں ۔ جہاں تک برسرکار اساتذہ کا تعلق ہے وہ تعلیم و تدریس کے فنی مطالعہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، غالباً اس لیے بھی کہ اس موضوع پر جو مواد غیر ملکی کتب سے ملتا ہے وہ ہمارے حالات و مقتضیات سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اور اس کا عملاً کوئی فائدہ نظر نہیں آتا —— تعلیم کے میدان میں تحقیق کا بھی یہی عالم ہے ۔ اگر کہیں کوئی تحقیقی کام ہوا ہے تو اس کے لیے بھی عموماً انگریزی زبان ہی کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا ہے ۔

ایک ترقی پذیر نظام تعلیم اور معیاری تدریس کے لیے علمی و تحقیقی مطالعہ کی اہمیت و افادیت محتاج بیان نہیں ۔ تعلیمی پالیسی کی تشکیل اور نصاب کی تدوین سے لے کر کمرۂ جماعت میں تدریس کے مراحل تک جدید نظریات و انکشافات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ ہماری تعلیم کی پسماندگی کا ایک سبب یہی ہے کہ ہمارا استاد دنیا کے حالات سے بے خبر اپنی ڈگر پر چل رہا ہے ۔ وہ جدید خیالات سے واقف نہیں اور نہ ان میں سے مفید خیالات کو اپنا کر اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کو بہتر بنا سکتا ہے —— پیش نظر کتاب ''تعلیمی مقالات'' کی تالیف کا جذبہ محرکہ یہی تعلیمی ضرورت ہے ۔ ان مقالات کے مصنف کو مدرسے سے لے کر یونیورسٹی کے درجہ تک کی تدریس کا تجربہ حاصل ہے اور تعلیمی موضوعات پر تحقیق کا موقع بھی ملا ہے ۔ اس

لیے ان مقالات میں اهل علم و تحقیق سے استفادہ کے علاوہ پاکستان کے مخصوص حالات کے مطابق مصنف نے اپنے ذاتی تجربات و افکار کا اظہار کیا ہے ۔ ان میں سے کئی مقالات ملک کے مقتدر تعلیمی جرائد میں شائع ہو چکے هیں اور بعض خطبات هیں جو تعلیمی کانفرنسوں میں پیش کیے گئے ۔

(مصنف)

# مقدمہ

بڑے زمانے کے بعد ایک ایسی کتاب نظر سے گزری ہے جسے میں پاکستان کے تعلیمی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہوئی انقلاب آفرین کہہ سکتا ہوں۔ یہ کتاب ڈاکٹر اصغر علی صاحب نے لکھی ہے جو پہلے استاد تھے، پھر استاد الاساتذہ ہوئے اور اب مفکر تعلیم ہیں اور اپنے گہرے تجربے سے نکلی ہوئی ایک عمدہ تصنیف ہمیں دے رہے ہیں۔

یوں تو ہمارے ملک میں استاد بہت ہیں اور استادوں کے استاد بھی بے شمار مگر فن تعلیم کے مفکر شاذ ہیں۔ جس ملک میں تعلیم کے فن اور مسائل پر چار سطریں لکھے بغیر ہی لوگ تعلیم کی سب سے اونچی کرسیوں پر متمکن ہو سکتے ہوں وہاں فن تعلیم کی مہارت یا اس پر غور و فکر اور تصنیف کی ضرورت بھی کیا رہ جاتی ہے، اور بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس دورِ بے ہنری میں ہر استاد یا مدرس کو ماہر تعلیم سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ وہ خود بھی اپنے آپ کو ماہر تعلیم سمجھنے اور کہنے لگتا ہے حالانکہ استاد ہونا اور شے ہے، ماہر تعلیم ہونا چیزے دیگر ہے اور مفکر تعلیم ہونا تو کرشمۂ کمال ہے۔ میں اسے کمال خوش بختی خیال کرتا ہوں کہ غور و فکر اور تحقیق و جستجو کی کساد بازاری کی اس فضا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے فن کے جملہ حقوق و فرائض کی تکمیل کو اپنے لیے واجب سمجھتے ہیں:

ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اور نمونہ ان کا ڈاکٹر اصغر علی ہیں جن کی زیر تبصرہ کتاب ان کی تعلیمی بصیرت اور ماہرانہ دقت نظر کا ثمر ہے۔ ڈاکٹر اصغر علی نے اپنی اس کتاب میں بہت سے تعلیمی مسائل سے اعتنا کیا ہے اور ہر مسئلے پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے۔ لیکن ان کے مقالات کی

مرکزی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پاکستان کی خاص تعلیمی مشکلات اور نزاعی امور و مسائل کا عالمانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

پاکستان میں تعلیم کے موضوعات پر لکھنے والے بالعموم یورپ اور امریکہ کے محققین تعلیم کے نتائجِ فکر سے استفادہ کرکے بلا تجزیہ ان افکار و تجربات کو پاکستان کے تعلیمی نقشے پر زبردستی چسپاں کر دیتے ہیں۔ نتیجۃً اس کا وہ تعلیمی بے آہنگی اور افراتفری ہے جو پاکستانی تعلیم میں روز افزوں ہمارے مشاہدے میں آ رہی ہے۔

تعلیم از بسکہ تجدیدی تصور نہیں، ایک عمل ہے جس میں معلم کے علاوہ، متعلم اور وہ معاشرہ بھی حصہ دار ہوتا ہے جو ایک مخصوص جغرافیے کی حدود میں اور مختص بالنوع نسلی، عمرانی اور دینی و روحانی عقائد کے دائرہ میں مصروف کار ہوتا ہے اس لیے کسی ایک ملک کا تعلیمی فلسفہ یا تعلیمی عمل ضروری نہیں کہ کسی دوسرے ملک میں بھی کامیاب ہو اور مؤثر ثابت ہو سکے۔ یہ درست ہے کہ بعض تجربوں اور طریقوں (Technique) سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن بنیادی فلسفہ ہر ملک کا اپنا ہوتا ہے اور عملی تکنیک ہر ملک کے بچوں کے مزاج اور ماحول کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔

ہم نے قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۶۰-۶۱ تک تجربہ کرکے دیکھ لیا ہے کہ ہماری تعلیم، امریکی تکنیک اور امریکی شعوریات کے پیوند کی وجہ سے کتنی بری طرح مجروح اور برباد ہوئی.....، شریف کمیشن کے ماہرین نے امتزاج کی جو کوشش کی ہے اس کے بہت برے نتیجے نکلے..... اور اب بھی اجنبی پیوند کی جو کوشش ہوگی ناکام ہوگی.... کیونکہ زرین اصول فقط یہ ہے کہ ہماری تعلیم ہمارے ماحول، ہمارے مزاج اور ہمارے عقائد کے مطابق ہی ہونی چاہیے۔ استفادہ دنیا جہاں سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تعلیم کا مزاج ہمارے ملی مزاج کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

میں نے یہ سوال اس لیے اٹھایا ہے کہ ڈاکٹر اصغر علی نے شاید پہلی مرتبہ ہمیں ایک ایسی تعلیمی حکمت دی ہے جسے ہمارے تعلیمی

نظام کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے..... اس میں ایک پاکستانی مفکر نے پاکستان کے نقطۂ نظر سے اپنی تعلیم کے مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔

اس مختصر مقدمے میں ڈاکٹر اصغر علی کے جملہ افکار و مباحث پر گفتگو ممکن نہیں..... اور سچ یہ ہے کہ ان میں سے بعض اصطلاحی موضوعات پر گفتگو کی اہلیت بھی نہیں رکھتا کیونکہ میں بھی محض معلم ہوں، ارباب تعلیم میں سے نہیں ہوں.....، بہرحال اس موقعہ پر ان کا ایک نہایت ہی اصولی مقالہ ''تدریس کے نظریات اور عمل میں تفاوت اور اس کا تدارک'' زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ ہمارے اساتذہ تربیت کے دوران بعض تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے روشناس کرائے جاتے ہیں مثلاً کھیل کھیل میں تعلیم، دلچسپ سرگرمیوں (Activities) کی ترویج وغیرہ وغیرہ۔ مگر جب وہ واپس اپنی درسگاہوں میں پہنچتے ہیں تو وہ ان اصولوں اور طریقوں پر عمل نہیں کرتے بلکہ وہی رسمی اور روایتی طریقہ جاری رکھتے ہیں..... اور نقصان یہ ہوتا ہے کہ تربیت کے دوران اصولوں کی جو تعلیم حاصل کرتے ہیں نام ان کا لے کر، اپنی تدریس کو دو عملی کا شکار اور بد مزہ بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس دو عملی اور تضاد کے لیے اساتذہ کے علاوہ پورے معاشرے کو بھی ذمے دار ٹھہرایا ہے اور لکھا ہے :

> ''یہ امر واقعہ نہیں کہ لین دین، کاروبار، مذہب، سیاست ..... غرض زندگی کے ہر شعبے میں جن نظریات اور اصولوں کا پرچار ہوتا ہے خود ان کا پرچار کرنے والے ہی عملاً ان کی تکذیب میں پیش پیش ہوتے ہیں.....''

لہذا بقول ڈاکٹر صاحب :

> ''استاد..... شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سیکھتا ہے کہ تدریس کے اصول و نظریات کو دین و سیاست کے اصول و

نظریات کی طرح مقدس تو ضرور سمجھو۔ ان کا پرچار بھی کرو
لیکن ان پر عمل درآمد کچھ ایسا واجب نہیں''۔

مذکورہ مقالے میں جو پرمغز بحث کی گئی ہے میں اس کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا (قارئین اصل کتاب میں پڑھ لیں) مجھے ڈاکٹر صاحب کے اٹھائے ہوئے موضوع پر ہی کچھ کہنا چاہیے۔

تدریس کے نظریات اور ان کے عمل میں تضاد کے جو اسباب ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمائے ہیں، وہ اپنی جگہ درست ہیں لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ خود وہ معاشرہ جس سے استاد بھی متاثر ہو جاتا ہے اس تضاد اور بے آہنگی کا شکار کیوں ہے؟ میں جانتا ہوں کہ اس سوال کا جواب آسان نہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی صورت حال کا کوئی ایک سبب ذمے دار نہیں ہوا کرتا۔ بہت سے اسباب مل کر ایک مجتمع نتیجہ برآمد کرتے ہیں.... تاہم کسی ایک سبب یا دو چار اسباب کی جزوی دریافت بھی خالی از فائدہ نہیں ہوتی۔

تعلیم میں.... یعنی ہماری پوری زندگی میں جو بے آہنگی، تضاد اور افراتفری ہے اس کا محوری سبب یہ ہے کہ ہماری تعلیم مغربی تہذیب اور مغربی معاشرہ کے ذہنی، جغرافیائی، نفسیاتی، سماجی و سیاسی عوامل کے رد عمل کے طور پر ظہور میں آئی ہے..... اور ہم ابھی تک مغرب کی تہذیبی روح کو نہ سمجھ سکے ہیں، نہ اسے اپنی فطرتوں میں جذب کر سکے ہیں ..... اور شاید قانون عمران کی رو سے کر بھی نہ سکیں گے۔ سچ پوچھیں تو میں یہ کہوں گا کہ ابھی تک ہم مغرب کی تیز رفتار سواریوں کے زیر اثر وجود میں آئی کشادہ سڑکوں پر آمد و رفت کے اصولوں اور طریقوں کو بھی جذب نہیں کر سکے....، میں نے اپنی آنکھوں سے اعلیٰ تعلیم یافتگان کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے چند سیکنڈ کی تکلیف سے بچنے کے لیے ٹریفک کی روکوں اور دیوارچوں کی پروا نہ کرتے آلٹے ہاتھ اپنی گاڑیاں چلاتے ہیں تا کہ چکر سے بچ جائیں خواہ اس میں ٹکر ہی ہو جائے..... تو تا بہ بے تعلیماں چہ رسد۔

یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ ہم نے مغربی تہذیب کے ظواہر تو اپنا لیے ہیں لیکن مغربی تہذیب کی روح..... تیز رفتاری، اصول پسندی، ذمے داری، تعاون اور بے معاوضہ لگن..... کو اپنا نہیں سکے۔

بس تعلیم کا مسئلہ بھی اسی طرح سمجھیے۔ ہم نے تعلیم کے ظواہر میں مغرب کے طریقوں کا کچھ اثر قبول کر لیا ہے مگر اس کی روح کو..... چونکہ ہماری عمرانی معاشرتی روح سے ہم آہنگ نہیں۔ اس لیے وہ نہ استاد جذب کر سکے ہیں نہ معاشرہ۔

مسئلہ معاشی بھی ہے..... امریکہ اور یورپ میں ہر معاملے میں ''شاہ خرچی'' ایک بنیادی اصول اور معاملہ ہے لیکن جس ملک میں ابتدائی تعلیم پانے والوں کو بیٹھنے کے لیے ٹاٹ تک میسر نہ ہو وہاں ''کھیل کھیل میں تعلیم''..... ''سمعی بصری ذرائع'' وغیرہ وغیرہ ضروری مگر شاہانہ ذرائع اور وسائل کس طرح میسر آ سکتے ہیں.... اور چونکہ میسر نہیں آ سکتے اس لیے نظریات اور عمل میں فرق ناگزیر ہے.... البتہ امراء کے (پبلک) سکولوں میں جہاں غریبوں کے ٹیکسوں سے حاصل شدہ رقم امراء کے بچوں پر خرچ ہوتی ہے وہاں اس قسم کے شاہانہ ذرائع ضرور مہیا ہوتے ہوں گے۔

مسلمانان ہند و پاکستان کا تعلیمی المیہ یہ ہے کہ غلامی و محکومی کے زیر اثر پچھلی صدی میں، ہماری تعلیمی روایت ٹوٹ گئی (بلکہ اس کے خلاف نفرت پھیلائی گئی) نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کے دو کیمپ قائم ہو گئے..... قدیم تعلیم کا کیمپ، میدان سے نکالے ہوئے سپاہی کے مانند، نئے دور کی ہر پیش قدمی کو اپنے خلاف سمجھتا رہا.... ادھر نئے کیمپ کا آدمی اپنی تہذیب و تعلیم سے نفرت و حقارت کا سلوک کرنے لگا۔

اگر ہماری تعلیم میں اس زمانے کی سیاست دخیل نہ ہوتی تو ہمارے یہاں ایک سالم تعلیمی نظام ظہور میں آتا جو جدید تکنیک کا استفادہ کرتے وقت مسلمانوں کے معاشرتی ماحول اور ان کے مزاج کا بھی لحاظ کرتا۔

اب ہماری ساری تعلیم تضادات کا مجموعہ ہے ، بچے گھر میں خدا کا ذکر سنتے ہیں ، یہ قرآنی قصہ والدین سے سن کر آتے ہیں کہ خدا نے آدم کو خود مٹی سے پیدا کیا ۔ ادھر انگریزی افکار سے متاثر استاد بچوں کو یہ بتاتا ہے کہ انسان بندر سے اور بندر کسی اور مخلوق سے ترقی پا کر اس شکل میں آیا ہے ..... اور یہ بھی معلوم نہیں مخلوق کہاں سے آئی .... شاید خود بخود وجود میں آ گئی ۔

بچہ اس تضاد سے حواس باختہ ہے ۔ گھروں میں بچہ یہ سن کر آتا ہے نیکی اور سچائی فتح یاب ہوتی ہے ۔ مدرسوں میں انگریزی یافتہ استادوں سے سنتا ہے :

Might is right اور Survival of the fittest اور Fit کے معنی صرف مادی طاقت جس کے لیے اخلاق ضروری نہیں ۔

غرض تضاد و تفاوت کا یہ سبب بھی ہے اور اس کے علاوہ کئی اور اسباب بھی ہیں جن کا ذکر ممکن نہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے تدارک کے لیے جو تجویزیں بتائی ہیں ان پر کچھ بھی عمل ہو جائے تو فائدہ ہوگا ..... مگر مرض گہرا ہے ۔ اس کی طرف بھی توجہ لازم ہے ۔

اس مجموعے میں رسم الخط سے متعلق جو مقالہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے بغایت مفید اور عالمانہ ہے ..... تعجب ہے کہ ہمارے ملک کے رومنی حضرات ، رومن جیسے ناقص اور غیر سائنٹیفک خط کی تبلیغ کس طرح کر رہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ رومن خط تو خواندہ لوگوں کو جاہل بنانے کا تیر بہدف نسخہ ہے ۔

مقالہ ابن خلدون ، جسمانی سزا ، تجدید نصاب کی تحریک ..... غرض کس کس مضمون کا ذکر کروں ۔ سارے ہی مقالے گہرے غور و فکر اور عمیق تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں ۔ ان سب کا تجزیہ و تبصرہ ممکن نہیں ۔

میں ڈاکٹر صاحب کا ذاتی طور سے ممنون ہوں اس امر کے لیے کہ انہوں نے یہ عالمانہ کتاب اپنی زبان اردو میں لکھی اور اردو

کا تعلیمی ادب اس کی بدولت با ثروت ہوا۔ اور ممنون ہوا اس وجہ سے بھی کہ میں نے مدرسی کے فن کے بارے میں (جس کا میں عمر بھر خادم رہا) ماہرانہ خیالات پڑھے جن میں سے اکثر سے میں مستفید ہوا اور بعض سے میرے اپنے غور و فکر کی تائید ہوئی۔

میں ڈاکٹر صاحب کو یہ مشورہ بھی دوں گا کہ ان مقالات کو یکے بعد دیگرے کسی انگریزی تعلیمی رسالے میں بھی چھپوائیں ..... تاکہ مغرب کے ماہرین تعلیم ہمارے مخصوص تعلیمی نظریات و ضروریات سے آگاہ ہوں۔

اس اردو والے سے (یعنی خاکسار سے) انگریزی میں کچھ لکھوانے کی یہ تلقین بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے مگر میرے مدنظر آیت ربانی غلبت الروم فی ادنیٰ الارض کی نوید ہے.....، میں کبھی اس نوید کے بارے میں متشکک یا مایوس نہیں ہوا.....، وقت آ گیا ہے کہ ہمارے اہل تعلیم اپنی ہستی کے ممکنات کے بارے میں آگاہ ہو کر اپنی خودی کا اظہار کریں۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ
صدر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

# فہرست مضامین

صفحہ

# اقتصادی اور سماجی ترقی میں تعلیم کا حصہ

(یہ خطبۂ صدارت سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کی بارھویں سالانہ سائنس کانفرنس ۱۹۷۰ء منعقدہ لائل پور کے شعبۂ تعلیمات و عمرانیات میں پڑھا گیا)

تعلیم و تدریس بلاشبہ ایک کار خیر ہے اور قومی فلاح و بہبود کے تمام منصوبوں میں تعلیم کا نمبر سر فہرست آتا ہے۔ تاریخ دان حضرات خوب جانتے ھیں کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں حکومت اور عوام تعلیمی درسگاھوں کے قیام و ترقی میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے اور تعلیم میں سرمایہ کاری کو وہ دولت کا بہترین مصرف سمجھتے تھے۔ عہد بنو عباس کے تقریباً سبھی خلفاء اور وزراء مدارس و مکاتب کو صرف کثیر سے قائم کرتے اور ان کی مالی اعانت کے لیے بڑی بڑی املاک اور جاگیریں وقف کرتے رہے۔ نظام الملک طوسی کے متعلق مصدقہ روایت ہے کہ وہ سرکاری بیت المال کے علاوہ اپنی ذاتی آمدنی کا دس فی صد حصہ بھی تعلیم پر خرچ کرتا تھا اور بہت سے شہروں میں اس کے نام سے مدرسے قائم تھے جن کی تمام تر کفالت صرف اسی کے ذمے تھی۔

برصغیر پاک و ھند میں بھی تعلیم کے فروغ کے لیے تمام مسلمان سلاطین اس جذبے سے کام کرتے تھے اور سلطنت کے امراء اور عوام بھی اس معاملے میں اپنے بادشاھوں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ خود انگریز مؤرخین اس بات کے شاھد ھیں کہ سلطنت مغلیہ کے زوال تک برصغیر کے چپے چپے پر ایسے مکاتب و مدارس موجود تھے جو شاھی خزانے، وقف املاک اور مخیر مسلمانوں کی مالی امداد سے

چلتے تھے اور جنھیں بعد میں آنے والے غاصب حکام نے اپنی ذاتی مصلحت کے پیش نظر ختم کر دیا۔

مادی اور روحانی اقدار کے تصادم میں جب تک روحانیت کا پلڑا بھاری رہا، مکتبوں اور مدرسوں کی مالی اعانت میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ وہ تعلیم کو صدقہ جاریہ سمجھتے تھے اور اسی لیے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تعلیم میں سرمایہ کاری سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ہے اور اس میں روپیہ لگانے سے دنیا میں دس گنا منافع ملتا ہے تو آخرت میں ستر گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ لیکن آہستہ آہستہ ہمارے ملک میں بھی مغرب کے زیر اثر مادی اقدار جب روحانی قدروں پر غالب آنے لگیں، اخروی نفع کا عقیدہ کمزور ہونے لگا۔ حکومت اور عوام کے نزدیک سرمایہ کمانے اور لگانے کا واحد معیار یہ ٹھہرا کہ مادی لحاظ سے کون سا کاروبار زیادہ سودمند ہے۔ چونکہ تعلیم کے متعلق عام تصور یہ تھا کہ اس میں سرمایہ کاری سے کسی فوری مادی منفعت کی توقع عبث ہے اس لیے تعلیم میں سرمایہ لگانے کا رجحان کم ہوتا گیا اور تعلیمی اداروں کی مالی اعانت میں مسابقت کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ سامراجی حکومت یہاں دولت ہی لوٹنے کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اسے کیا پڑی تھی کہ وہ یہاں کے لوگوں کی تعلیم میں دلچسپی لیتی اور اس پر سرمایہ لگاتی۔ بس جتنی تعلیم سے اس حکومت کا کاروبار چل سکتا تھا، صرف اس حد تک تعلیم کو مخصوص سامراجی مقاصد کے حصول کے لیے رواج دیا گیا اور ملکی آمدنی کا نہایت قلیل حصہ جو آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتا ہے تعلیم پر خرچ ہوتا رہا۔

برصغیر کے مسلمان بھی جو مادی رجحانات سے مغلوب ہو چکے تھے اور یوں بھی ان کی اکثریت مالی اعتبار سے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، تعلیم کو سنبھال نہ سکے اور تعلیمی اداروں کی حالت اپاھج خانوں سے بھی بدتر ہو گئی۔ مکتبوں اور مدرسوں کے طلباء بچی کھچی روٹیوں، باسی سالن، بوسیدہ چٹائیوں اور پھٹے پرانے کمبلوں میں پروان چڑھنے لگے اور قریب قریب یہی صورت حال برصغیر کی آزادی

کے وقت تک قائم رہی۔ توقع تھی کہ آزادی کے فوراً بعد ان رجحانات میں تبدیلی آئے گی اور حکومت اور عوام دونوں میں تعلیمی خدمت کا وہی جذبہ پھر عود کر آئے گا جس کی درخشاں مثالیں ہمیں آزاد اسلامی حکومتوں میں ملتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور مادی ترقی کا بھوت کچھ اس طرح سے ہم پر سوار ہوا کہ انفرادی اور قومی دونوں سطحوں پر سرمایہ کاری کی شرط اول نفع اندوزی قرار پائی اور آمدنی کا ۱۰ فی صد تو کجا، ۱۰ فی ہزار بلکہ ۱۰ فی لاکھ بھی تعلیم کے لیے وقف نہ ہو سکا۔ عوام نے یہ سمجھا کہ تعلیمی سہولتوں کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے لہذا اسے حکومت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بحیثیت مجموعی لوگوں کا تعلیمی مدارس کی اعانت کا وہ جذبہ سرد پڑ گیا جس کے تحت کبھی لاہور کے ہر گھر میں ہر روز ایک مٹھی آٹا اور ہر دوکان پر تانبے کا ایک پیسہ انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی اداروں کے لیے وقف کر دیا جاتا تھا۔ سود و زیاں کا وہ تصور بھی نہ رہا جس کے تحت حضرت عثمانؓ نے اپنے تمام اونٹ مدینہ منورہ کے بڑے سے بڑا نرخ لگانے والے تاجروں کو بیچنے کے بجائے یہ کہہ کر غرباء میں مفت تقسیم کر دیے کہ جتنا منافع اللہ کے ہاں سے ملے گا، تم اتنا منافع مجھے نہیں دے سکتے۔ اس دور میں تو بہرحال کاروباری اور سرکاری سطح پر منصوبہ بندی کے وقت معیشت کے انہی عالمگیر اصولوں اور سرمایہ کاری کے جدید رجحانات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے جو مادی ترقی کے ضامن اور روحانیت سے نا آشنا ہیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ حکومت، کاروباری ادارے اور متمول افراد تعلیمی منصوبوں میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائیں اور علمی امور کو دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے ہم پلہ یا ان سے بہتر سمجھیں تو پھر ہمیں بہرحال یہ ثابت کرنا ہو گا کہ تعلیم میں سرمایہ کاری بھی نفع بخش سودا ہے اور تعلیمی ادارے ملک کی اقتصادی ترقی میں براہ راست ممد و معاون ہیں اور جب تک ہم یہ ثابت نہیں کر سکیں گے ہم اپنے ملک کے منصوبہ بندوں اور مالیات کے محاسبوں سے تعلیم کے لیے زر کثیر حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اگر نظریاتی سطح پر نہیں تو عملاً آج بھی یہی

رجحان کارفرما ہے کہ تعلیم ایک خسارے کا محکمہ ہے۔ اس میں سرمایہ کاری گھاٹے کا سودا ہے۔ اس میں خرچ ہی خرچ ہے، نہ کوئی آمدنی ہے نہ کوئی منافع اور اسی وجہ سے اسے ساجی بہبود کے ان چند محکموں کے ساتھ نتھی کر کے رکھ دیا گیا ہے جن کی کفالت حکومت محض اس لیے کرتی ہے کہ اپنے نامۂ اعمال میں کچھ ثواب بھی لکھوا لے۔

تعلیم کے بارے میں یہ تصور کہ اس میں سرمایہ کاری مادی لحاظ سے نفع بخش نہیں ہے، بڑا ہی فرسودہ، باطل اور گمراہ کن ہے۔ عصر حاضر کے ماہرین اقتصادیات نے اپنی تحقیق و جستجو سے اس تصور کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور اس کی بجائے ایک نئے تصور کو جنم دیا ہے کہ تعلیم میں سرمایہ لگانے سے جو اقتصادی منافع حاصل ہوتا ہے وہ کسی بھی دوسرے مادی کاروبار میں روپیہ لگانے سے حاصل نہیں ہوتا۔

اس نئے تصور کو جس عقیدے نے جنم دیا ہے وہ یہ کہ معاشی اور اقتصادی ترقی میں بنیادی حیثیت سرمائے کی نہیں بلکہ انسان کی ہے، جو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مادی وسائل کو کام میں لاتا اور سرمائے کے صحیح اور غلط مصرف میں تمیز کرتا ہے۔ ایک کند ذہن، غبی اور غیر تعلیم یافتہ انسان کی نسبت ایک ذہین تعلیم یافتہ اور صاحبِ ادراک انسان سے سرمایہ لگانے اور اس سرمائے سے بہتر منافع حاصل کرنے کی زیادہ توقعات ہو سکتی ہیں۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں ماضی کا یہ عقیدہ بحیثیت مجموعی غلط ثابت ہو چکا ہے کہ

ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی     تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

یا یہ کہ:

بہ ناداں آنچناں روزی رساند     کہ دانا اندراں حیران بماند

(یعنی قدرت جاہل انسان کو اس طرح دولت عطا کرتی ہے کہ دانا اسے دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔)

میری اس گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس دور میں ہر جاہل بھوکا مرتا ہے اور ہر عاقل اور تعلیم یافتہ انسان دولت مند ہے۔

بلکه اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ درست ہوگا کہ آج کے سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں ایک جاہل کی نسبت ایک عاقل اور تعلیم یافتہ انسان کے دولت مند ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہیں اور آج ایک پڑھا لکھا انسان اپنے طبقے کے ایک ان پڑھ آدمی سے بالعموم زیادہ خوشحال اور صاحب ثروت ہے۔ ہمارے اس عقیدے نے جس کی رو سے ہم نے روزی کو محض مقدر سے وابستہ کر رکھا ہے، معاشرے میں کم کوشی اور تن آسانی کو فروغ بخشا ہے اور لوگوں میں اس رجحان کو اور قوی کر دیا ہے کہ جاہ و دولت کا حصول کسی کی ذاتی صلاحیت اور زور بازو پر موقوف نہیں۔

دور حاضر میں سائنس کی ترقی و ترویج نے عوام الناس کو سائنسی شعور عطا کیا ہے۔ سائنسی نقطۂ نگاہ اور سائنسی انداز فکر بخشا ہے اور اسی فکر کی بدولت ہم نے یہ راز پایا ہے کہ اقتصادی ترقی خواہ کسی فرد کی ذات تک محدود ہو یا قوموں اور ملکوں پر حاوی، اس کا دار و مدار شخصی صلاحیتوں کی جلا اور قومی صلاحیتوں کے نکھار پر ہے اور وہ تمام سرمایہ جو انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور فکر آدم کی آبیاری میں لگایا جائے وہ سرمائے کا بہترین مصرف ہے، اس کا ضیاع نہیں۔ کیا سطح زمین کی تہہ میں مدفون خزانوں کا کھوج تربیت یافتہ افرادی قوت کے بغیر ممکن ہے؟ کیا سمندروں کی گہرائیوں میں پوشیدہ دولت تک ایک جاہل اور ان پڑھ قوم کی رسائی ہو سکتی ہے؟ کیا ارضی و سماوی آفات سے بچاؤ اور قومی ذخائر کا تحفظ علم کے بغیر ممکن ہے؟ اس دور میں اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ علم حاصل کیے بغیر دنیا بھر کے مادی وسائل سے مستفید ہو سکتا ہے تو ایں خیال است و محال است و جنوں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آج جبکہ تسخیر قمر کے منصوبوں کی کامیابی نے ثابت کر دیا ہے کہ:

عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

ہم اقتصادی ترقی کی معراج تک پہنچنے کے لیے انسانی وسائل کو بروئے کار لائیں اور فرد کی صلاحیتوں کو اس حد تک فروغ دیں کہ وہ ظاہر و مخفی دونوں طرح کے وسائل سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ اگر

هم اقتصادی اعتبار سے عظیم اقوام پر ایک نظر دوڑائیں تو ہمیں امریکہ ، جاپان ، جرمنی ، روس ، چین اور انگلستان ایسے ممالک کی حیرت انگیز اقتصادی ترقی کا راز ان کے عظیم اور مفید نظام تعلیم میں ملتا ہے۔ یہی وہ قومیں ہیں جو اپنی قومی منصوبہ بندی میں تعلیم کو سرفہرست رکھتی ہیں اور تعلیم پر اپنی مجموعی قومی آمدنی کا چھ سے آٹھ فی صد تک خرچ کر رہی ہیں جبکہ پاکستان میں تعلیم پر صرف ہونے والی رقم مجموعی قومی آمدنی کا بمشکل ۱ء۶ فی صد ہے۔ لہذا میں یہ مفروضہ قائم کرنے میں حق بجانب ہوں کہ ترقی یافتہ ممالک اس لیے امیر اور صاحب ثروت ہیں کہ وہ اپنی مجموعی قومی آمدنی کی ایک معقول شرح تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ اور پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی پسماندگی اور افلاس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیم پر اپنی آمدنی کا بہت کم حصہ خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض ممالک چونکہ زیادہ امیر اور اقتصادی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اس لیے وہ اپنی تعلیم پر زیادہ سرمایہ صرف کر سکتے ہیں اور پسماندہ ممالک اپنی غربت اور افلاس کے باعث تعلیم پر زیادہ خرچ کرنے سے قاصر ہیں۔

بلاشبہ یہ دلیل بھی کسی حد تک قابل توجہ ہے کیونکہ ایک سویڈش ماہر عمرانیات گنر مِرڈال (Gunner Myrdal) کے بقول جہالت اور افلاس ایک شیطانی چکر میں گھومتے ہیں۔ لوگ اس لیے جاہل ہیں کہ وہ غریب ہیں اور لوگ اس لیے غریب ہیں کہ وہ جاہل ہیں۔ لیکن جن قوموں نے اس شیطانی چکر سے نجات حاصل کی ہے ان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انہیں یہ نجات تعلیم ہی کے ذریعے ملی ہے۔ نیز جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں ملک ہمارے مقابلے میں تعلیم پر بہت زیادہ سرمایہ صرف کرتا ہے تو اس سے مراد کسی ملک کے تعلیمی بجٹ کا دوسرے ملک کے تعلیمی بجٹ سے موازنہ نہیں ہوتا۔ اگر اس طرح سے سوچا جانے لگے تو پھر امریکہ کی بڑی یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک یونیورسٹی کا بجٹ ہمارے پورے ملک کے تعلیمی بجٹ سے بڑھ جائے گا۔ ایسا موازنہ اور مقابلہ نہ مقصود

ہے نہ قابل التفات ، ہم تو محض یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کوئی ملک اپنی مجموعی قومی پیداوار کا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ کتنا حصہ تعلیم پر خرچ کرتا ہے اور اگر ایک یا ایک سے زیادہ ممالک چھ سے آٹھ فی صد تک تعلیم پر خرچ کر سکتے ہیں تو پاکستان اپنی آمدنی کے دو فی صد سے زائد کیوں خرچ نہیں کر سکتا ۔ کیا اس کی اصل وجہ کہیں یہی تصور تو نہیں کہ تعلیم میں سرمایہ کاری ایک غیر نفع بخش سودا ہے اور اگر واقعی ہماری منصوبہ بندی میں یہی تصور اور یہی رجحان کار فرما ہے تو میں بصد ادب و نیاز اپنے ان منصوبہ بندوں کی خدمت میں جن کے ہاتھ میں ملکی معیشت کی زمام ہے ، چند تحقیقی شواہد پیش کرنے کی جسارت کروں گا ۔ اس لیے نہیں کہ وہ تعلیمی اقتصادیات کی تازہ ترین تحقیقات سے واقف نہیں ، نہ اس لیے کہ وہ منصوبہ بندی میں انسانی وسائل کے فروغ کے لیے سرمایہ کاری کو کچھ کم اہم سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ان تمام جدید رجحانات اور نئے اقتصادی نظریات سے واقف ہوتے ہوئے بھی انہیں لائق التفات یا قابل عمل نہیں سمجھتے ۔ نامعلوم کیوں ؟

''کسی معاشرے کی اقتصادی ترقی کا دار و مدار سائنس دانوں ، انجینئروں اور تربیت یافتہ ہنر مندوں پر ہے اور جب تک کسی ملک کا نظام تعلیم صحیح اور استوار بنیادوں پر موجود نہ ہو ، ایسی تربیت یافتہ افرادی قوت کی بہم رسانی کسی قوم کے لیے ممکن نہیں ۔ جب اس نظریے سے تعلیم کی اہمیت کو پرکھا جائے تو یہ بات بڑی ہی معقول نظر آتی ہے کہ تعلیم میں سرمایہ کاری کو ہم کسی صنعت میں روپیہ لگانے کے مترادف سمجھیں[1]'' ۔

ہمارے ماہرین اقتصادیات اور مشیران مالیات شاید اس بات کو محض ماہرین تعلیم کا قول سمجھ کر رد کر دیں اس لیے ہم چند ایسے لوگوں کے اقوال نقل کرتے ہیں جنہیں اقتصادیات میں امام ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ مثلاً آدم سمتھ (Adam Smith) کے نزدیک تعلیم

---

1. Government of Pakistan, *Ministry of Education*, Report of the Commission on National Education (Karachi: Government of Pakistan Press, 1961), p. 339.

کو اقتصادی ترقی میں سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے[2] ۔ مال تھیوس (Malthus) نے لکھا کہ تعلیم سے خاندانی منصوبہ بندی کا رجحان جنم لیتا ہے ۔ جس کے بغیر اقتصادی ٹھہراؤ کا تصور ممکن نہیں[3] ۔ ایلفرڈ مارشل (AlfredM arshall) کے نزدیک سرمائے کا سب سے بہترین مصرف یہ ہے کہ اسے انسانی وسائل کی ترقی میں لگایا جائے[4] ۔

تھیوڈر شلٹز (Theodre Schultz)[5] ، گیری بیکر (Gray Baker) اور دیگر ماہرین اقتصادیات کے بقول اقتصادی ترقی کے سلسلے میں تعلیمی خدمات کا جائزہ بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طرح سے حاصل ہونے والے منافعوں سے لیا جا سکتا ہے ۔ بلا واسطہ منافع کی مثال تو یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ایک فرد نے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے کیا کمایا اور محض تعلیم کی وجہ سے اس کی اپنی زندگی اقتصادی اعتبار سے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کتنی بہتر ہوئی ۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک ہنر مند اپنے دوسرے ہم پیشہ مگر غیر ہنر مند آدمی کے مقابلے میں زیادہ کمانے کی اہلیت رکھتا ہے اور اسے زیادہ کمانا چاہیے ۔ پس اسی طرح سے ہم مختلف تعلیمی قابلیت رکھنے والے افراد کی سالانہ یا ماہوار آمدنی کا باہمی موازنہ کر کے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنی تعلیم پر زیادہ سرمایہ لگایا انہوں نے اپنی تعلیم ہی کے باعث اپنے ان دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں جنہوں نے اپنی تعلیم پر کم خرچ کیا تھا ۔ نسبتاً زیادہ دولت کمانے کی صلاحیت حاصل کر لی ۔ جان ویزی (John Vaizey) کا قول ہے کہ تعلیم حاصل کرنے سے نقد معاوضے کی شکل میں ان لوگوں

---

2. Adam Smith, *The Wealth of Nations*,| Part IV, ed. Edwin Cannau (New York: Random House, 1937), p. 535.

3. Thomas Robert Malthus, *Principles of Political Economy London*, 1820), p. 251 quoted in John Vaizey, *The Economics of Education* (New York: The Free Press of Glencoe, Inc., 1962), p. 19.

4. Alfred Marshall, *Principles of Economics* (8th ed.; London: Macmillan and Company, Limited, 1930), p. 216, quoted in John Vaizey, *The Economics of Education* (New York: The Free Press of Glencoe, Inc., 1962), p. 19.

5. Theodore Schultz, *Education and Economic Growth*, Social Forces Influencing American Education, Sixtieth Year Book of the National Society for the Study of Education, Part II, ed. Nelson B. Henry (Chicago: University of Chicago Press, 1961), p. 76.

کو زیادہ منافع ملتا ہے جو اپنی تعلیم پر زیادہ خرچ کرتے ہیں[6]۔ تعلیم سے بلاواسطہ منافع کے علاوہ جو فوائد بالواسطہ حاصل ہوتے ہیں وہ بے شمار ہیں۔ مثلاً ایک تعلیم یافتہ فرد اپنی زیادہ آمدنی کے باعث ٹیکس دینے کی اہلیت حاصل کر لیتا ہے اور یوں ٹیکسوں کی ادائیگی کے ذریعے قومی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ نیز اس کی تعلیم اسے زیادہ مفید شہری بناتی ہے اور وہ انسانی روابط اور اخلاقی اقدار کی نزاکت کو بہتر سمجھتا ہے اور قوم کو ایسی قیادت عطا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ شلٹز (Schultz) نے ۱۹۵۶ء میں امریکہ میں اس مفروضے کی تحقیق کے لیے کہ فرد کے تعلیمی معیار کا اس کے اقتصادی معیار سے کیا تعلق ہے، ایک مطالعہ کیا۔ اس نے اپنے مطالعے میں امریکی نسل کے بہت سے افراد کے تعلیمی کوائف اور ان کی ایک سال کی آمدنی کے اعداد و شمار اکٹھے کیے اور یوں اس نے ان پڑھ، کم تعلیم یافتہ اور زیادہ تعلیم یافتہ افراد کی آمدنیوں کا موازنہ کیا۔ اس مطالعہ کے مطابق ان پڑھ افراد کی سالانہ اوسط آمدنی کے مقابلہ میں آٹھ جماعت تک پڑھے ہوئے لوگوں کی اوسط آمدنی دو گنا تھی[7]۔

اسی طرح ایک روسی ماہر اقتصادیات مسٹر سٹینسلوف (Stanislov) نے ایک تحقیقی مطالعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ فنی مدرسے میں ایک سال کی تعلیم سے ایک فرد کی اوسط آمدنی اس فرد کی اوسط آمدنی کے مقابلے میں ۲ء۶ گنا زیادہ ہوتی ہے، جس نے مدرسے کے بجائے شاگرد پیشہ کی حیثیت سے کوئی ہنر سیکھا ہو۔ اس مطالعے سے اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ پرائمری تک تعلیم یافتہ افراد کی اوسط آمدنی ان پڑھ افراد کی اوسط آمدنی سے ۷۹ فی صد زیادہ تھی۔ علیٰ ھذ القیاس سات سال تک تعلیم حاصل کرنے والے افراد ان پڑھ افراد کے مقابلے میں ۲۳۰ فیصد زیادہ کما رہے تھے اور تیرہ اور چودہ سال تک تعلیم پانے والے افراد کی اوسط آمدنی ایک ان پڑھ فرد کی اوسط آمدنی کی نسبت ۳۲۰ فی صد

---

6. John Vaizey, *The Economics of Education* (New York: The Free Press of Glencoe, Inc., 1962), p. 35.

7. Theodore Schultz, *Ibid.*

زیادہ تھی[8]۔ ظاہر ہے جو لوگ اپنی تعلیم کی وجہ سے خود زیادہ کماتے ہیں ۔ وہ مختلف طریقوں سے قومی آمدنی کے وسیلوں اور قومی خزانے میں بھی اضافہ کرتے ہیں اور ان کی خوشحالی پورے ملک کی خوشحالی پر دلالت کرتی ہے ۔

حال ہی میں ایک امریکی ماہر اقتصادیات کارنیلسن (Cornelsen) نے اپنے ایک تحقیقی مطالعہ میں جو امریکہ کی مرکزی وزارت تعلیم کی سرپرستی میں انجام پایا ، یہ ثابت کیا ہے کہ ایک ایسے ہنرمند انسان کو جس کا ہنر اب جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہ رہا ہو ایک سال کی مدت میں نیا ہنر سکھانے پر جو خرچ کیا جائے گا وہ ضائع نہیں جائے گا ۔ نئے ہنر کی بدولت یہ ہنر مند فرد بے کار رہنے کے بجائے پہلے ہی سال میں اوسطاً ۱۸۰م ڈالر کما سکے گا اور یہ رقم اس رقم سے تقریباً تین گنا ہے جو اس کے نئے ہنر کی تربیت پر خرچ ہوگی ۔ اور تو اور حکومت جتنی رقم ایسے کسی ہنر مند پر اسے نیا ہنر سکھانے پر خرچ کرتی ہے ، نیا ہنر سیکھنے کے بعد یہ کاریگر اتنی ہی رقم پانچ سال کی مدت میں انکم ٹیکس کی صورت میں مرکزی حکومت کو ادا کر دیتا ہے اور اس تربیت نو کے جو دیگر فوائد صوبائی اور قومی معیشت کو ہوتے ہیں وہ اس پر مستزاد ۔ اس مطالعے سے اس امریکی محقق نے یہ ثابت کیا کہ بجائے اس کے کہ حکومت کسی کاریگر کو بے کاری الاؤنس دے کر اس بات کا انتظار کرے کہ اس قسم کے آدمی کی کب مانگ نکلے اور کب اسے روزگار سہیا ہو، یہ کہیں بہتر ہے کہ اس شخص کو سال بھر میں سرکاری خرچ پر ایک نیا ہنر سکھا کر روزی کمانے کے قابل بنا دیا جائے[9]۔

اقتصادی اور عمرانی علوم کے ایک مشہور عالم آدم کرل (Adam Curle) کا نام تو آپ نے سن رکھا ہوگا۔ کرل لکھتا ہے :

”صحت اور تعلیم میں سرمایہ لگانے سے جو منافع حاصل ہوتا

8. Strumlin Stanislov, *The Economics of Education in the U.S.S.R.*, International Social Science Journal, XIV, No. 4 (1962), p. 635.

9. Leroy A. Cornelsen, *The Economics of Training Unemployed*, School Life, XLVII (October, 1964), pp. 17-18.

ہے غالباً کسی اور شعبہ میں سرمایہ کاری سے اتنا یا اس سے زیادہ منافع حاصل نہیں ہو سکتا۔ پڑھے لکھے، صحت مند اور ہنر مند لوگ اگرچہ کسی ملک میں اقتصادی ترقی کی اتنی واضح علامت تو نہیں ہوتے جس قدر کہ بجلی پیدا کرنے کا بہت بڑا مرکز یا فولاد کا کوئی کارخانہ، لیکن فی الواقع ان افراد کی اصل قدر و قیمت اقتصادی ترقی کی ان ظاہری علامات سے کہیں زیادہ ہے،،[10]۔

کرل کا یہ بیان درست کیوں نہ ہو، کیونکہ فولاد کا کارخانہ ہو یا بجلی پیدا کرنے کا پلانٹ، اصل اہمیت تو انسانی دماغ اور فنکار کے اس ہاتھ کی ہے جو ان تمام منصوبوں کو حیات بخشتا ہے اور ان سے خاطر خواہ فوائد حاصل کرتا ہے۔

ایک اور ماہر اقتصادیات ولیم بوون (Willian Bowen) نے اپنے بہت سے گراں قدر تحقیقی مطالعوں کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تعلیم میں سرمایہ کاری سے بحیثیت مجموعی بہت سے قابل قدر مالی اور غیر مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں[11]۔ اسی طرح عصر حاضر کے مشہور امریکی ماہر اقتصادیات جان کینتھ گیلبرتھ (Gallbraith, John K.) نے بڑے وثوق سے یہ بات کہی ہے کہ کسی قوم کی اقتصادی ترقی کا راز دو باتوں میں مضمر ہے۔ اول یہ کہ اس کی پوری آبادی خواندہ ہو اور دوم یہ کہ اس کے پاس ایک محدود اقلیت میں اعلیٰ درجے کی فنی صلاحیتوں سے بہرہ ور لوگ موجود ہوں[12]۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے محدود اقلیت کی شرط قابل توجہ ہے۔

---

10. Adam Curle, *Educational Strategy for Developing Societies London*: Tavistock Publications, 1963), p. 795.

11. William G. Bowen, *Assessing the Economic Contribution of Education*. An Appraisal of Alternative Approaches, "a paper prepared for the meeting of the Study Group in Economics of Education OECD, Paris, June 1962, (mimeographed), p. 42, quoted in Frederick Harbison and Charles A. Myers, *Education Manpower and Economic Growth* (New York: McGraw-Hill Book Company, 1964), p. 10.

12. John K. Galbraith, *A Positive Approach to Foreign Aid*, Foreign Affairs, XXXIX, No. 3 (April, 1961), p. 444.

یہ نہ ہو تو ملک میں بے روزگاری کا ایک سیلاب اُمڈ آئے گا اور تعلیم میں سرمایہ کاری نفع بخش ہونے کی بجائے مضرت رساں ثابت ہوگی[13] -

ہاربی سن اور مائرز (Harbison & Myers) نے اپنے حالیہ تحقیقی مطالعے میں یہ جانچنے کے لیے کہ کونسا ملک اقتصادی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور کون سا کم، ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ اس معیار کے اجزاء ملاحظہ فرمائیے :

۱ - خواندگی کی شرح -
۲ - کسی ملک میں اساتذہ کی مجموعی تعداد -
۳ - اساتذہ کی تعداد کا ملک کی پوری آبادی سے تناسب -
۴ - ابتدائی مدرسوں میں طلباء کی تعداد اور اس تعداد کا اس عمر کے بچوں کی آبادی سے تناسب -
۵ - ملک میں قومی مجموعی پیداوار (G.N.P.) -
۶ - فی کس اوسط آمدنی (Income per Capita) -
۷ - مجموعی قومی پیداوار (G.N.P.) کی شرح جو تعلیم پر خرچ ہوتی ہے -

ہاربی سن اور مائرز (Harbison & Myers) نے ان تمام اعداد و شمار پر مبنی ایک عددی فارسولا تیار کیا ہے جس کی مدد سے انہوں نے دنیا کے تمام ممالک کو ترقی کے لحاظ سے چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے - سامعین و قارئین کرام کی اطلاع کے لیے یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ہاربی سن (Harbison) کے اس فارسولے کی رو سے پاکستان ترقی کے لحاظ سے چوتھے طبقے یعنی پسماندہ ممالک کی صف میں شامل ہے -

اس تحقیق کے حوالے سے مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ ماہرین اقتصادیات کے نزدیک اقتصادی ترقی کو جانچنے کا معیار اب کارخانوں

---

13. Frederick Harbison and Charles A. Myers, *Education, Manpower and Economic Growth*: Strategies of Human Resource Development (New York: McGraw-Hill Book Company, 1964), pp. 29-40.

کی چمنیاں اور ہرے بھرے کھیت نہیں ۔ بلکہ کسی ملک میں طلباء اور اساتذہ کی تعداد اور تعلیمی مصارف کا مجموعی قومی آمدنی سے تناسب ہے ۔

حکومت امریکہ کے اقتصادی مشیروں کی کونسل نے ۱۹۶۲ء میں اس بات کی تائید کی تھی کہ ہنر مند افرادی طاقت کی تیاری میں تعلیم کا بڑا حصہ ہے اور اسی لیے تعلیم میں سرمایہ کاری کسی ملک کی اقتصادی ترقی میں فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتی ہے[14]۔ یونیسکو کے نزدیک تعلیم محض معاشری اور تہذیبی اقدار کے احیاء اور فروغ کا ذریعہ ھی نہیں بلکہ اقتصادی ترقی کا ایک مؤثر اور کامیاب آلہ بھی ہے[15]۔ عالمی بنک کا یہ فیصلہ کہ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو تعلیمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے اسی طرح سے قرضے دیے جائیں جس طرح دوسرے صنعتی اور زرعی منصوبوں کی تکمیل کے لیے دیے جاتے ھیں[16] ، اس بات کا واضح اور بین ثبوت ہے کہ دنیا بھر کے ماھرین اقتصادیات اب اس بات پر متفق ھیں کہ تعلیم میں سرمایہ لگانا کوئی غیر نفع بخش سودا نہیں ۔ بلکہ اس سے وھی اقتصادی نتائج اور فوائد متوقع ھیں جو کسی اور کاروباری منصوبے میں سرمایہ لگاتے وقت پیش نظر رکھے جاتے ھیں ۔

مندرجہ بالا جملہ شواھد و حقائق اس امر پر دلالت کرتے ھیں کہ تعلیم انفرادی و قومی اقتصادی ترقی کے لیے ایک بڑے مضبوط اور قابل اعتماد زینے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ اس زینے کی تعمیر و کشادگی پر جو بھی سرمایہ لگے گا وہ بہرحال معاشرے کی اقتصادی ترقی کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ ہیڈن ہاورڈ (Hayden Howard) نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ تعلیم دلانے اور تعلیم حاصل کرنے ، ہر دو کا صلہ بہت وقیع اور حاصل بڑا عظیم ہوتا ہے[17]۔ البتہ یہ

---

14. The Council of Economic Advisors, Policies for Economic Growth. *The Goals of Economic Growth*, ed. Edmund S. Phelps (New York: W.W. Norton and Company, 1962), pp. 154-56.

15. UNESCO, *Economic and Social Aspects of Educational Planning* (Place de Fontenay Paris, 1964), p. 13.

16. *Ibid.*

17. Hyaden Howard, *Administration and the Economics of Education*, International Social Science Journal, XIV, No. 4 (1962), 700-705.

ضروری ہے کہ تعلیم میں جو سرمایہ لگایا جائے وہ کسی واضح منصوبہ بندی کے تحت ہو۔ ایسی منصوبہ بندی جو قابل اعتماد اعداد و شمار پر مبنی ہو، جو افرادی قوت کی مانگ کے بارے میں سائنسی جائزہ کی روشنی میں ہوئی ہو اور جس سے صاحبان فن اور ہنر مندوں کی بے روزگاری کے مسائل پیدا ہونے کا امکان نہ ہو۔

تعلیم اقتصادی لحاظ سے کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو، یہ امر بہرحال مسلم ہے کہ ہمارے کلچر اور ہمارے مذہب میں تعلیم ایسی ارفع اور وقیع شے کو نہ مادی معیار سے ماپا جا سکتا ہے اور نہ اسے کسی ایسے ترازو کے پلڑے میں ڈالنا چاہیے جس سے تعلیم محض ایک بکاؤ مال بن کے رہ جائے۔ تعلیم کی جنس بہرحال خرید و فروخت کے اس محدود تصور سے بالاتر ہے۔ یہ ایک ایسا پاکیزہ عمل ہے جو انبیاء کی سنت اور صالحین کا وظیفہ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جس کی بدولت دنیا میں معاشری انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسان اپنی ذات کو پہچانتا ہے اور اپنی نجات کی راہیں متعین کرتا ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک تعلیم ایک بشری ضرورت ہے کہ اسی سے انسان عام حیوانات سے ممیز ہوتا ہے اور یہی چیز اسے اشرف المخلوقات بناتی ہے۔ میں نے البتہ تعلیم کے اقتصادی پہلو پر محض اس لیے زیادہ زور دیا ہے کہ میں پوری شدت سے اس بات کو محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری حکومت اور عوام تعلیم پر اتنا سرمایہ خرچ نہیں کر رہے جس قدر خرچ کرنے کی صلاحیت اور استطاعت ان کے پاس ہے۔ مجموعی قومی پیداوار (G.N.P.) کا صرف ۱٫۶ فی صد خرچ کرنا جبکہ یونیسکو نے پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے لیے کم از کم ۴٫۵ فی صد خرچ کرنے کی سفارش کر رکھی ہو، اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ ہمیں تعلیمی، معاشری یا اقتصادی لحاظ سے دوسرے ممالک کے ہم پلہ ہونے یا ان کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ ہے نہ خواہش۔ ہمارے ملک کے رؤساء، بڑے بڑے زمیندار اور کارخانہ دار تعلیم میں سرمایہ کاری کے معاملے میں جس سرد مہری کا ثبوت دے رہے ہیں اس کی کہانی ہمارے ابتدائی مدارس اپنی زبان حال سے سنا

رہے ہیں ۔ اس کی روئیداد سنی ہو تو ہمارے ثانوی مدارس کے در و دیوار سے کان لگا کر سنیے ۔ افسوس کہ خوف طوالت ان داستانوں کے سننے اور سنانے میں مانع ہے ۔ اس لیے مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دیجیے تاکہ میں ان سماجی و عمرانی اثمار کی بات کر سکوں جو شجر تعلیم سے ہمیں حاصل ہوتے ہیں ۔

تعلیم کو ہمیشہ سے تہذیب و ثقافت کا وارث سمجھا جاتا ہے ۔ تعلیم ہی ایک ایسا مؤثر آلہ ہے جس کے ذریعے کسی قوم کے تہذیبی ورثے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے ہیں ۔ تمام ماہرین عمرانیات اور علمائے تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ایک باقاعدہ اور مؤثر نظام تعلیم کی عدم موجودگی میں کسی قوم کی سماجی ترقی ممکن نہیں ۔ قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں یہ بات بڑی صراحت سے مندرج ہے کہ نظام تعلیم ہی کے ذریعے کوئی قوم اپنے تمام افراد کو ان صلاحیتوں سے بہرہ ور کر سکتی ہے جن سے متصف ہونا مفید اور بھرپور زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے ۔ مغربی مفکرین میں سے ہال اور لاوریز (Hall & Lauwerys) تعلیم کو ایک سماجی دستور تصور کرتے ہیں جو فرد کے مقدر کو سنوارتا ہے اور اس کے مستقبل کی تشکیل کرتا ہے[18] ۔ بیسویں صدی کا مشہور مفکر تعلیم جان ڈیوی (John Dewey) اپنی کتاب ”تعلیم اور سماجی تغیر“ (Education and Social Change) میں لکھتا ہے[19] :

”تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ فرد کو ایسا فہم اور ایسی بصیرت عطا ہو جائے جو اسے اس قابل بنا دے کہ وہ مدرسہ سے باہر قدم رکھتے ہی معاشرے کی تعمیر و تنظیم کے عظیم کام میں ہاتھ بٹا سکے اور یہ کہ تعلیم فرد میں ایسی عادات ، سوچ اور فکر پیدا کر دے جس سے اس کی سوجھ بوجھ اور بصیرت عملاً مؤثر ثابت ہو“ ۔

---

18. Robert King Hall and J.A. Lauwerys (ed.) *The Year Book of Education* (London: Evans Brothers Limited, 1956), p. 1.

19. John Dewey, *Education and Social Change*, Education and Social Order, ed. Mercer and Carr (New York: Rinehart and Company, 1957).

بومین (Bowman) کے خیال میں ایک تعلیم یافتہ معاشرے کے افراد بغیر کسی صلے یا معاوضے کے خیال سے مفید شہری سرگرمیوں میں شریک ہوتے اور سماجی خدمات انجام دیتے ہیں - نیز یہ کہ پڑھے لکھے شہری عام طور پر جرائم کے ارتکاب سے پرہیز کرتے ہیں اور سماجی سہولتوں سے اپنے حق سے زیادہ استفادہ کرنے کو نامناسب خیال کرتے ہیں[20] -

ایک روسی ماہر عمرانیات ، تعلیم کی افادیت اور تعلیم میں سرمایہ کاری کی اہمیت کا جواز پیش کرتے ہوئے بڑی وضاحت سے کہتا ہے کہ تعلیم سے مزدور عوام کے تہذیبی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے[21] -

یہ امر فاضل سامعین و قارئین سے مخفی نہیں کہ کسی سماج کی ترقی کی راہ میں معاشری تفاوت اور سماجی درجہ بندی سنگ گراں کی حیثیت رکھتے ہیں - تعلیم کا کمال یہ ہے کہ وہ سماجی درجہ بندی کی نہ صرف سرے سے تکفیر کرتی ہے بلکہ نچلے طبقوں کے لوگوں کو سماج کے ایک درجے سے نکال کر اونچے طبقات میں داخل ہونے کا پروانہ عطا کرتی ہے - گویا تعلیم سماجی ارتقاء کے زینے کا حکم رکھتی ہے - تعلیمی عمرانیات (Educational Sociology) کے ماہر رابرٹ ہیوی گرسٹ (Robert Havighurst) نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ تعلیم معاشرے کو استحکام بھی عطا کرتی ہے اور اس کے ارتقاء کی ضمانت بھی دیتی ہے - معاشرہ تعلیم کے ذریعے نہ صرف اپنی روایات اور اقدار کو محفوظ کر لیتا ہے بلکہ ان روایات اور اقدار میں ضرورت اور تقاضے کے مطابق مناسب ترمیم و تنسیخ بھی کرتا رہتا ہے - ہیوی گرسٹ (Havighurst) کے خیال میں ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں جہاں متوسط طبقہ بالعموم مفقود ہوتا ہے ، تعلیم اس طبقے کو جنم دینے اور بڑھانے میں بڑا مؤثر کردار ادا کرتی ہے[22] - معاشرے

---

20. Marry Jane Bowman, *Social Returns to Education,* International Social Science Journal, XIV, No. 4 (1962), pp. 647-59.

21. Stanislov, p. 646.

22. Robert Havighurst and Bernice Neugarter, *Society and Education* (2d ed.; Boston: Allyn and Bacon, 1962), pp. 288-90.

میں جمہوری طرز حکومت کا شعور تعلیم ھی کی بدولت ملتا ھے اور تعلیم ھی سے ایک جمہوری معاشرے میں ووٹ کی قدر و قیمت کا احساس جنم لیتا ھے۔ ھمارے اپنے ملک میں ایک اچھا جمہوری معاشرہ اسی لیے نہیں پنپ سکا کہ نہ تو یہاں ایک مناسب نسبت سے متوسط طبقہ موجود ھے اور نہ ھی رائے دھندگان اپنی رائے کی قدر و قیمت سے واقف ھیں۔ چنانچہ آزادی کے بائیس برس بعد بھی نمائندے کی اھلیت اور صلاحیت کی بجائے دیگر وجوھات کی بناء پر ووٹ دیے جاتے ھیں۔ ھمارے دیہات میں جہاں ملک کی ۸۳ فی صد آبادی رھتی ھے معاشرہ دو طبقوں میں منقسم ھے۔ ایک زمیندار اور دوسرا کارکن۔ دیہی معاشرہ میں یہ طبقاتی درجہ بندی معاشری ارتقاء کی راہ میں بہت بڑی روک ھے اور جب تک ھمارے سماجی ڈھانچے کی محرابوں اور برجوں میں مناسب ترمیم نہیں کر دی جاتی۔ اس وقت تک معاشرے سے انسانی استحصال، اقتصادی ناانصافیوں اور غیر منطقی عدم مساوات کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سماجی تفاوت ھی تو ھے جو ھمارے معاشرے کے ذھین و فطین افراد کو آگے بڑھنے سے روکتا ھے، جو عالم طفولیت ھی میں تعلیمی شوق کا گلا گھونٹتا اور ترقی کی راھوں پر پہرے بٹھاتا ھے۔ انسانی استحصال کے گناہ کبیرہ کے مرتکب معاشرے میں سماجی تفاوت ختم کیے بغیر سماجی بہبود کے خواب دیکھنا جنوں نہیں تو اور کیا ھے۔ عمرانیات کے اور بہت سے عالموں کی طرح آدم کرل (Adam Curle) بھی اس بات پر ایمان رکھتا ھے کہ سماجی ناانصافیوں اور عدم مساوات کا خاتمہ محض تعلیم ھی کے ذریعے ممکن ھے[23]۔ یہی وجہ ھے کہ ھمارے ملک کے بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے مدرسے کو اپنے گاؤں کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے کہ کہیں ایسا نہ ھو کہ کل کو ان کے کسی کمی کا بیٹا لکھ پڑھ کر ان کے سامنے کرسی ڈال بیٹھے یا اپنے مکان کی چھت ان کی چھت سے اونچی اٹھا لے۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا جو مجھے کسی ایک مشفق و مہربان ماھر تعلیم نے سنایا تھا۔ یہ صاحب کبھی

23. Curle, p. 81.

حیدر آباد میں ڈائریکٹر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں ان کے پاس سندھ کا ایک زمیندار آیا اور اس نے درخواست کی کہ ان کے گاؤں میں اگر حکومت مدرسہ بنا دے تو وہ اس کے لیے پانچ ہزار روپے نقد اور عمارت مہیا کر دے گا۔ ڈائریکٹر صاحب کو بھلا اس سے بہتر شرائط اور کہاں سے ملتیں۔ جھٹ ان شرائط پر مدرسہ کھولنے کا حکم صادر فرما دیا۔ لیکن تعجب یہ کہ وہ گاؤں جہاں اس زمیندار نے مدرسہ کھلوایا اس کا اپنا گاؤں نہ تھا بلکہ اس کے ایک سیاسی حریف کا وطن مالوف تھا۔ جب فریق ثانی نے دیکھا کہ اس کا حریف یوں کمال عیاری سے اس کے گاؤں میں مدرسہ کھلوانے میں کامیاب ہو گیا ہے تو فوراً ڈائریکٹر صاحب کے پاس پہنچا اور کہا کہ جناب والا میں پانچ ہزار روپے کے بجائے دس ہزار روپے اور عمارت دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ یہ اسکول جو آپ نے میرے حریف کے کہنے پر میرے گاؤں میں کھولا ہے، اس کے گاؤں میں منتقل کر دیا جائے۔

یہ تو خیر محض ایک لطیفہ تھا لیکن تعلیم کو جب وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ افراد کے نقطۂ نگاہ اور انداز فکر بدلنے کا نہایت ہی کامیاب اور مؤثر وسیلہ ہے۔ تعلیم لوگوں میں تغیر کو قبولنے اور جدید رجحانات کو زندگی میں اپنانے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ تعلیم سے طبائع میں سلامتی، بردباری، تحمل اور انسانی ہمدردی ایسے پاکیزہ جذبات راہ پاتے ہیں۔ تعلیم انسان کو جمہوری تقاضوں سے روشناس کراتی اور جمہوری اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اس کے دم سے لوگوں میں سیاسی شعور اور سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ثقافتی بیداری رونما ہوتی ہے اور اس سے افراد کے جذبوں کی تہذیب اور ان کے افکار و خیالات کی تطہیر ہوتی ہے۔ پورٹر (Porter) نے سچ کہا ہے کہ[24]:

"تعلیم کا مقصد صرف یہ تو نہیں کہ وہ افرد کو ایسی مہارتوں

---

24. Willis P. Porter, *Education for Economic Development in India and Pakistan*, Phi Delta Kappan, XLVII, No. 4 (December, 1965).

سے لیس کر دے جن کے ذریعے صنعتی فروغ اور زرعی ترقی کا حصول ممکن ہو، بلکہ تعلیم کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ اس سے انسانی کردار کی جلا ہو اور ذہنی افکار کا نکھار، تاکہ توہم پرستی اور جوتش پر بھروسہ رکھنے سے جو معاشری برائیاں پیدا ہوتی ہیں، انسان کو ان سے نجات حاصل ہو۔ اور اس کے بجائے انسان تدبر اور تفکر سے کام لے کر اپنی زندگی کا ایسا لائحہ عمل بنا لے جو عقل و دانش پر مبنی ہو اور فرد اپنے آپ کو مجبور محض سمجھنے اور تقدیر کا غلام تصور کرنے کے بجائے خود اعتمادی اور حوصلہ مندی کا پیکر بن کر مثبت اقدام کر سکے۔ بھارت اور پاکستان ہر دو ممالک میں تعلیم کے لیے جو چیز بہت بڑے چیلنج کا حکم رکھتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ ایسے ذرائع تلاش کرے جن کے ذریعے عوام الناس کو بہتر طریقے سے زندگی بسر کرنے کے جذبے سے روشناس کرایا جا سکے اور انہیں ایک عمدہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔،،

ڈان آدم (Don Adams) کے نزدیک عصر حاضر میں جبکہ آبادی تیز رفتاری سے بڑھتی جا رہی ہے تعلیم کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد بالعموم ازدواجی زندگی میں منصوبہ بندی سے کام لیتے ہیں اور بچوں کی تعداد کو بڑھنے نہیں دیتے [25]۔

مندرجہ بالا بیانات، حقائق اور شواہد سے اس بات کی صراحت ہو جاتی ہے کہ اگرچہ تعلیم میں سرمایہ کاری کے جملہ فوائد اور منافع نہ عددی تجزیوں کے مرہون ہیں اور نہ انہیں شماریاتی چوکھٹوں پر کسا جا سکتا ہے، تاہم یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ تعلیم کے مرئی اور غیر مرئی فوائد اس کثرت سے ہیں کہ ان سب کا احاطہ ممکن نہیں۔ بلاشبہ تعلیم ہی وہ سرچشمہ ہے جو انسانی معاشرہ کو آب حیات پلا کے انسانی اقدار کو حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔

---

25. Don Adams, *Education and Health of Nations*, Phi Delta Kappan, XLVII, No. 4 (December, 1965), p. 173.

اسی سے انسانی ارتقاء اور سماجی مساوات کے ایسے سوتے پھوٹتے ہیں جو اپنی لہروں میں شخصی استحصال اور مجلسی ناھمواریوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے کی قدرت رکھتے ہیں - البتہ شرط یہ ہے کہ نظام تعلیم کو اسلامی اصولوں پر استوار کیا جائے اور اس کی تشکیل قرآن کے دستور کے مطابق ہو- نیز یہ کہ اس مملکت خدا داد کے ارباب بست و کشاد تعلیمی مصارف کو بوجھ سمجھنے کی بجائے اپنی منصوبہ بندی میں صنعتی اور زرعی مصارف کے برابر جگہ دیں کہ تعلیم میں سرمایہ کاری ایک ایسا پھل دار درخت لگانے کی مانند ہے جو ذرا دیر سے پھل لاتا ہے لیکن اس کا پھل بڑا لذیذ ہوتا ہے اور بے حد رسیلا -

# ابن خلدون ایک عظیم مفکر تعلیم

تاریخ کے اُس دور میں جب اقوام یورپ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں گھری ہوئی تھیں اور موجودہ دور کا عظیم ترین ملک امریکہ ابھی نئی دنیا کی حیثیت سے صفحہ ہستی پر اُبھرا بھی نہ تھا۔ دنیائے اسلام میں ایک ایسی ہستی نمودار ہوئی جو آسمان علم و فضل پر آفتاب بن کر چمکی۔ یہ عظیم شخصیت جو علمی حلقوں میں ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے بڑی پہلودار تھی۔ ابن خلدون اپنے وقت کا نابغۂ جلیل تھا۔ وہ بیک وقت عالم دین بھی تھا اور سیاست داں بھی۔ مؤرخ بھی تھا اور جغرافیہ داں بھی۔ وہ فلسفۂ تاریخ کا بانی تھا اور فلسفۂ اجتماعیہ (عمرانیات) کا پیش رو۔ ابن خلدون یہ سب کچھ تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک معلم اور ماہر تعلیم تھا۔ درس و تدریس اور فلسفۂ تعلیم میں جتنی دانشوری اور بصیرت، قدرت نے اُسے عطا کی تھی، شاید اس دور میں کسی کو میسر نہ آئی ہوگی۔

ابن خلدون کی زندگی کے پہلے دور کو چھوڑ کر، جو اس کے سیاسی مشاغل اور عروج و زوال کی کہانیوں پر مشتمل ہے، اس کی باقی تمام زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزری۔ ۱۳۷۴ء میں قلعہ ابن سلامہ میں قیام اختیار کرنے کے بعد مسلسل چار سال تک سیاسی سرگرمیوں اور دیگر علائق دنیوی سے قطع تعلق کرکے ابن خلدون تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس دور میں اس کی شہرہ آفاق تصنیف ''مقدمہ،، ظہور میں آئی، اور اسی زمانے میں اس کے حلقۂ درس کی اتنی شہرت ہوئی کہ آس پاس کے دینی حلقوں اور علمی محفلوں میں ایک دھوم سی مچ گئی۔ یہاں تک کہ ٹیونس کے سب سے بڑے مفتی محمد بن عرفہ کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد ابن خلدون کے درس میں شریک ہو گئی۔ یہی چیز مفتی صاحب کی ناراضگی کا باعث ہوئی اور ابن خلدون جو اس سے قبل کئی

مرتبہ اپنے احباب کی رقابت اور ہم عصروں کے رشک و حسد کا شکار ہو چکا تھا۔ میدان علم و فضل میں قدم رکھنے کے بعد بھی اس سے بچ نہ سکا اور اُسے آخر ٹیونس کو خیر باد کہہ کر مصر کی راہ لینا پڑی۔

علمی نقطہ نگاہ سے ابن خلدون کے لیے یہ تارک الوطنی اس کے علم کو مزید جلا بخشنے کا باعث ہوئی اور اُسے قاہرہ اور دمشق ایسے مراکز علم و فضل میں درس و تدریس کے مواقع میسر آئے۔ عدیم المثال کتب خانوں سے استفادے کا موقع ملا، اور اس طرح اس کی علمیت اور شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اٹھائیس سال کے طویل عرصے پر پھیلا ہوا، ابن خلدون کی زندگی کا یہ دور، بے حد اہم اور قابل توجہ ہے۔ اس دور میں وہ قضاۃ کے بلند منصب پر فائز ہوا، اور اسی دور میں اسے جامعہ ازہر اور مدرسہ کاملیہ ایسی بلند پایہ علمی درسگاہوں میں پڑھانے کا موقع ملا، اور ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر طٰہ حسین کے قول کے مطابق یہاں اس نے مقدمہ پر نظر ثانی کی ہو اور اس میں کچھ ضروری ترامیم اور مفید اضافے بھی عمل میں آئے ہوں۔

ابن خلدون نہ صرف خود ایک کامیاب معلم تھا، بلکہ فن تدریس میں اس کی بالغ نظری اور فلسفۂ تعلیم و تربیت میں اس کی ژرف بینی، اس کی خدا داد ذہانت اور قابلیت پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ ابن خلدون کے ان تعلیمی نظریات کا جائزہ لیتے ہیں جو اس کی شہرت کے ضامن اور اس کی بے پناہ علمی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔

ابن خلدون کے نزدیک علوم و فنون کی تحصیل انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زندگی کے بنیادی تقاضوں یعنی غذا طلب کرنے، ٹھکانا چاہنے یا ان جیسی دوسری بنیادی صفات میں انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ جو چیز انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی قوت فکر ہے۔ انسان فکری قوتوں ہی کی بدولت امور معاش پر غور کرتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ معاملات کی نوعیت پر توجہ دیتا ہے اور عمرانی زندگی کی بنیاد ڈالتا ہے۔ یہی قوت فکر انسان کو انبیاء کی تعلیم سے آگاہ کرتی ہے اور آخرت کی درستی کی راہیں سجھاتی ہے۔ اس قوت فکریہ کی بدولت علوم و فنون کے

چشمے ابلتے ھیں اور اسی کے سہارے مختلف صنعتوں کے سوتے پھوٹتے ھیں - یہی فکری صلاحیتیں انسان کو اس بات پر آکساتی ھیں کہ وہ یہ جانے کہ متقدمین نے کسی چیز کے بارے میں کیا کہا ہے اور متاخرین نے اس پر کیا کیا اضافے کیے ھیں - اس طرح انسان پر حقیقت کا بھید کھلنے لگتا ہے اور اس کے تعلقات پر سے تمام پردے یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جاتے ھیں اور اس کا نتیجہ یہ ھوتا ہے کہ رفتہ رفتہ علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا ھو جاتا ہے جو علم کے دیے جلاتا چلا جاتا ہے اور آنے والے ادوار اس کی لو سے منور ھوتے چلے جاتے ھیں - یہی وہ مقام ہے جہاں سے تعلیم و تعلم کی ابتدا ھوتی ہے - اور علم کا قافلہ رواں دواں آگے بڑھتا رھتا ہے - اشاعت علم کا یہ انداز اور سیکھنے سکھانے کا یہ اسلوب بالکل قدرتی اور طبعی ہے اور تعلیم و تعلم کو اگر زندگی کے دوسرے تقاضوں کی طرح تقاضائے بشریت سمجھا جائے تو یہ بے جا نہ ھوگا - فضیلت علم کے بارے میں تو ھر دور میں کچھ نہ کچھ کہا جاتا رھا ہے - لیکن تحصیل علم کو بشری تقاضا قرار دینا اور پھر اسے فلسفیانہ دلائل سے ثابت کرنا ، ابن خلدون ھی کا حصہ ہے اور اس کے اس نظریے کو جس قدر سراھا جائے کم ہے -

ابن خلدون نے تمام علوم کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے - طبعی علوم اور نقلی علوم -

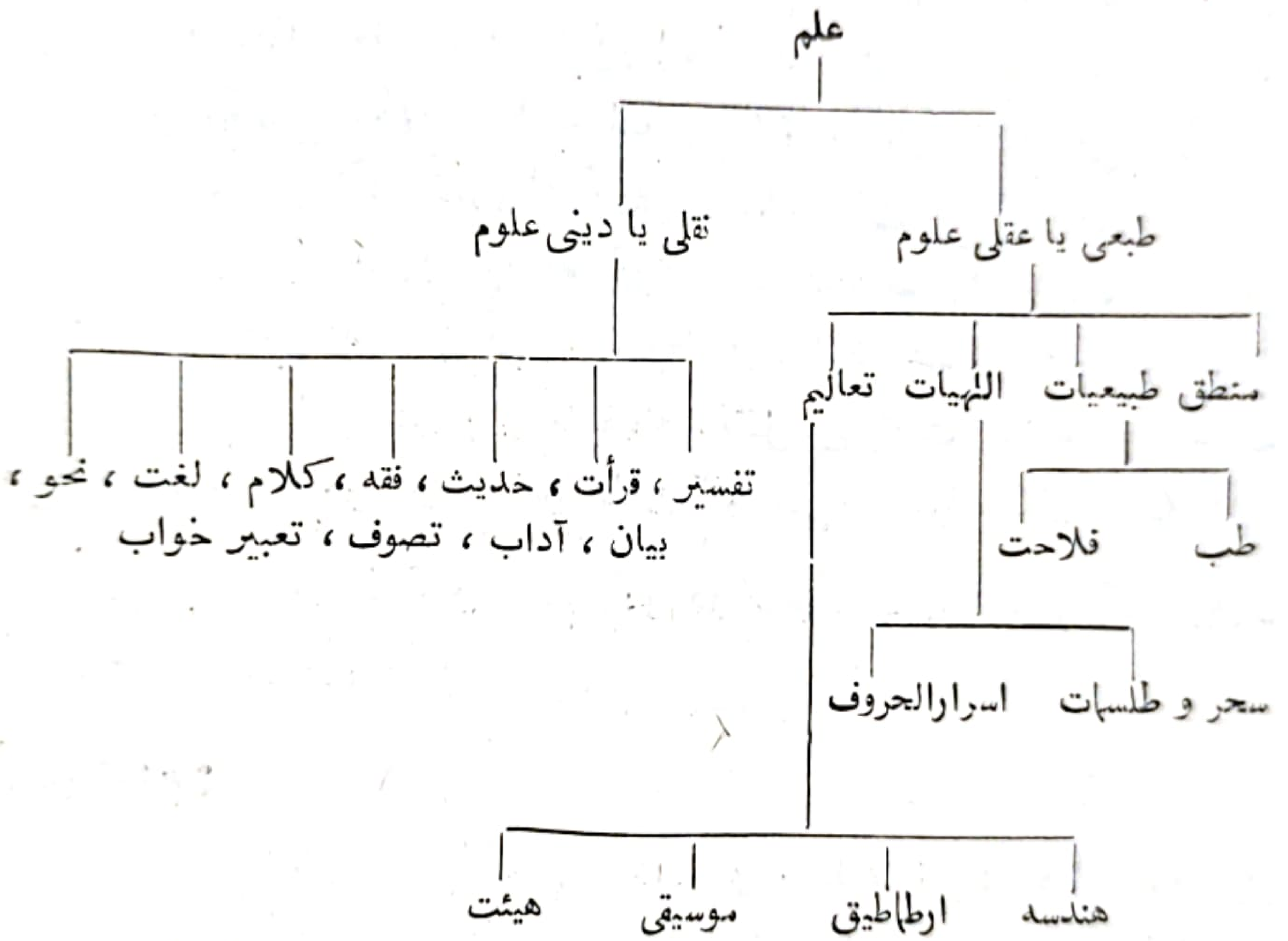
**طبعی علوم :**

ان علوم سے ایسے علوم حکمیہ و فلسفیہ مراد ھیں جن کے موضوعات ، مسائل ، دلائل اور وجوہ تعلیم کے بارے میں جملہ معلومات انسان خود اپنے قوائے عقلیہ کی مدد سے بہم پہنچاتا ہے اور انسان خالصتاً اپنی ذھنی طاقتوں سے کام لیکر ان علوم میں مہارت پیدا کرتا ہے اور چراغ عقل ھی کی روشنی سے خطا و صواب میں تمیز کرتا ہے - ابن خلدون کی رائے میں انسان چونکہ باالطبع صاحب فکر و عقل ہے اس لیے علوم عقلیہ اس کے لیے طبعی ھیں اور یہ علوم کسی قوم یا طبقۂ انسانی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام اقوام عالم میں ان کا سراغ ملتا ہے اور ابتدائے خلقت انسانی سے یہ دنیا میں رواج پذیر ھیں -

**نقلی علوم :**

ان سے مراد ایسے علوم ہیں جو کسی وسیلے سے انسان تک پہنچتے ہیں اور انسان محض اپنی عقل کی رسائی سے ان تک نہیں پہنچ سکتا ۔ ان سے مراد وہ علوم دینیہ ہیں جو شارع علیہ السلام سے ہم تک پہنچے اور صحابۂ کرام اور علمائے امت کے ہاتھوں ان پر اضافہ ہوتا چلا گیا ۔

علامہ ابن خلدون نے طبعی یا عقلی اور نقلی یا دینی علوم کو کئی شاخوں میں تقسیم کیا ہے جن کا شجرہ درج ذیل ہے :




جملہ علوم کی دو بڑے شعبوں میں تقسیم پر تو کسے اعتراض ہو گا ، البتہ اس کی ذیلی تقسیم میں اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے ، اور ممکن ہے بعض لوگ تعبیر خواب کو اور بعض تصوف کو دینی علوم میں شمار کرنے پر معترض ہوں ، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ابن خلدون نے ان علوم کی اہمیت کے بارے میں کن نظریات کا اظہار کیا ہے ۔

ابن خلدون کی رائے میں ہر قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں قسم کے علوم میں دسترس بہم پہنچائے ، اس لیے کہ قوموں کی نشو و نما اور ارتقاء میں ہر دو علوم اہم حصہ لیتے ہیں ۔ البتہ ابن خلدون کے نزدیک علوم دینیہ کو اوّلیت اور اولیّت حاصل ہے کیونکہ دینی علوم ہی سے انسان کی حقیقی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ۔ دینی علوم کے بارے میں علامہ کی رائے اُن کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے ۔

> ”جان لیجیے کہ ملت اسلامیہ میں قرآن کی تعلیم بچوں کے لیے ایک دینی شعار تسلیم کی گئی ہے اور تمام شہروں میں اسی پر عمل درآمد ہے ۔ اس میں یہ غرض پیش نظر ہوتی ہے کہ بچے کے دل میں سب سے پہلے ایمان جڑ پکڑ لے ، اور آیات قرآنیہ پر اس کے عقائد پختہ ہو جائیں .... بہرحال سوچا یہ گیا ہے کہ بچے کی آنکھ جب قرآن پر کھلے گی تو اس کی تعلیم مابعد کے لیے قرآن پاک اصل و بنیاد ٹھہرے گا اور تمام علوم کی عمارت اسی مبارک بنیاد پر اُٹھے گی“۔

دینی علوم میں سے ابن خلدون نے سحر و طلسمات ، علم نجوم اور کیمیا گری پر بے لاگ تنقید کی ہے اور ان کی تعلیم کو بنی نوع انسان کے لیے نقصان دہ قرار دیا ہے ۔ ابن خلدون نے فلسفہ پر بھی شدید نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ اس تعلیم کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ دین سے ہماری تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اور مذہب اسلام ہی ہماری صحیح سعادت کا ضامن ہے ۔ اس کے برعکس فلسفہ ایک بے کار چیز ہے اور یہ خوف ہے کہ ہم کو کہیں یہ سیدھے راستے سے منحرف نہ کر دے ۔ ابن خلدون کے فلسفہ کے بارے میں ان نظریات پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے کڑی تنقید کی ہے اور بڑے افسوس کے ساتھ کہا ہے کہ ابن خلدون نے فلسفہ کے ساتھ بھی اسی بیگانگی کا مظاہرہ کیا جو اس نے اپنے مختلف آقاؤں سے روا رکھا ۔ جس طرح وہ اپنے آقاؤں کی مہربانی سے بہرہ اندوز ہو کر اور ان کی خدمت سے فائدہ اُٹھانے کے بعد انہیں چھوڑتا رہا اور ان سے خیانت کا دلیرانہ اقدام کرتا رہا ، اسی طرح اس نے مقدمہ کی ابتدا میں فلسفیانہ اصولوں

فنی اصطلاحات میں بیان کی ہیں ۔ ابن خلدون بڑے سادہ لیکن مؤثر انداز میں کہہ گیا ہے ۔ اس بیان میں مندرجہ ذیل نکات بالخصوص قابل غور ہیں :

۱ ۔ تدریس میں آسان سے مشکل کی طرف اقدام کرنا چاہیے نہ کہ مشکل سے آسان کی طرف ۔

۲ ۔ مواد تدریس میں ترتیب کا قائم رکھنا ضروری ہے ۔ ابتدائی اور انتہائی مسائل کو خلط ملط کر دینے سے تدریس مؤثر اور سودمند نہیں رہتی ۔

۳ ۔ بچے حسی اور مقرون مثالوں سے مختلف مسائل کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں ۔

۴ ۔ مختلف مسائل پڑھاتے وقت بچوں کی علمی استعداد پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ بچے کا ذہن جس چیز کے سمجھنے سے قاصر ہو اس کی تعلیم سے پرہیز بہتر ہے ۔

۵ ۔ آمادگی کا لحاظ رکھے بغیر بچوں کو تعلیم دینا انہیں علم سے متنفر کر دینے کے مترادف ہے ۔

اپنے دور کے اساتذہ اور اپنے زمانے کے مروجہ طریقہ ہائے تعلیم پر تنقید و تبصرہ کے بعد ابن خلدون نے علوم کا مفید طریقہ بتایا ہے اور پورے تعلیمی عمل کے تین درجے متعین کر دیے ہیں ۔

**تعلیم کا پہلا مرحلہ :**

ابن خلدون کے نزدیک تعلیم کا مفید ترین طریقہ یہ ہے کہ علوم کو رفتہ رفتہ اور تھوڑا تھوڑا ذہن نشین کیا جائے ۔ مثلاً جب ایک خاص فن پڑھانے بیٹھیں تو اس کے ہر باب کے اصولی مسائل بیان کریں اور اجمالی طریقے سے ان کی تشریح بھی کرتے جائیں مگر متعلم کی قوت عقلیہ اور اس کی استعداد کو ضرور پیش نظر رکھیں تاکہ جو بات بتائی جائے اس کا ذہن اس کو قبول کرتا جائے ۔ یعنی کسی فن کی ابتدا میں صرف موٹی موٹی حقیقتیں بیان کی جائیں اور ان کی ضروری تشریح

کی جائے۔ نیز یہ دیکھا جائے کہ گرد و پیش کی محسوس اشیاء کو کس حد تک بطور امثلہ و نظائر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

**دوسرا مرحلہ :**

اس مرحلہ میں اس فن کے بارے میں نسبتاً اونچی سطح کے مسائل بیان کیے جائیں۔ اس فن کی تعلیم از سر نو شروع کریں اور اس مرتبہ تعلیم کا معیار کچھ بلند کریں۔ یعنی اجمال کو چھوڑ کر شرح و بسط کے ساتھ مسائل کو سمجھائیں اور ساتھ ساتھ اختلافی مسائل پر بھی روشنی ڈالتے جائیں اور وجہ اختلاف بھی کھولتے جائیں اور اسی اسلوب سے تعلیم کو آخر علم تک پہنچائیں۔ اس مرحلے پر متعلم میں جو مہارت پیدا ہوگی وہ پہلی حاصل کی ہوئی مہارت سے کچھ بہتر اور پختہ تر ہوگی۔

**تیسرا مرحلہ :**

اب پھر تیسری مرتبہ اس فن کی تعلیم نئے سرے سے شروع کریں نہ کہ جہاں سے چھوڑی تھی اور اس دور میں کسی مشکل، دشوار اور مغلق مسئلہ کو بغیر کسی واجبی تشریح و توضیح اور تنقیح کے نہ چھوڑیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں طلباء سے کسی فن میں ملکۂ کامل اور مہارت تامہ کی امید رکھی جا سکتی ہے۔

ابن خلدون کی رائے میں ہر فن کی تدریس اور ہر مہارت کی تعلیم کو تین درجوں میں بانٹنے سے اس فن میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو جاتی ہے البتہ تیز فہم اور ذکی طلباء تین کی بجائے صرف دو مرحلوں میں بھی وہی ملکہ حاصل کر سکتے ہیں جو ایک متوسط درجے کا طالب علم تین درجوں میں بہم پہنچاتا ہے اور ایسے بچوں کی تعلیم دو مرحلوں ہی میں انجام پانی چاہیے۔ علامہ نے یہ بات کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ ذہین اور تیز خواں طلباء کی تعلیم کو متوسط درجے کے طلباء کی تعلیم سے مختلف چیز خیال کرتا ہے اور دونوں گروہوں کے طلباء کو الگ الگ مختلف طریقوں سے تعلیم دینے کا حامی ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک یہ بات بڑی نامناسب ہے کہ کسی متعلم کی استعداد اور قابلیت کو پیش نظر نہ رکھتے ہوئے اس کتاب کے علاوہ جو طالب علم نے شروع کر رکھی ہو اس سے اوپر کی کتابوں کے مسائل پڑھائے جائیں ۔ اس سے طلباء کے ذہن پر ناقابل برداشت بوجھ پڑتا ہے ۔

**ایک وقت میں ایک فن :**

ابن خلدون نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک فن پڑھایا جائے۔ علامہ کی یہ گرانقدر رائے علامہ ھی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :

> ”طریق تعلیم میں یہ امر بھی واجب الرعایت ہے کہ دو علم بہ یک وقت نہ پڑھائے جائیں ، ورنہ کسی میں بھی درک نصیب نہ ہوگا ، کیونکہ اس صورت میں متعلم کی توجہ اور سمجھ بٹ جائے گی۔ وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف جائے گا اور دوسرے کو چھوڑ کر پہلے کی طرف آئے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دونوں سے محروم رہے گا اور پھر آخر میں دونوں علوم کو مشکل جان کر مایوسی کا شکار ہو جائے گا اور اگر ایک ھی علم پر اپنی فکر کو وقف کر دے گا تو اس میں کچھ کر دکھائے گا“۔

ابن خلدون کے دور میں ایسی کتابیں نصاب میں شامل تھیں اور آج بھی درس نظامی میں ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ھیں جن میں بیک وقت ایک کی بجائے دو علوم پر بحث کی گئی ہے ۔ منطق کی کتابوں میں فلسفہ کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے ۔ مثلاً تصنیفات ملا حسن ، حمد اللہ ، قاضی مبارک یہ سب منطق کی کتابیں ھیں ، لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے ھیں ۔ جب ایک ھی کتاب میں متعدد فن بھر دیے گئے ھوں تو خلط مبحث ھو جاتا ہے اور اس سے طالب علم کا ذہن پریشان ھو جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ھو جاتا ہے کہ وہ کونسا فن حاصل کر رہا ہے ۔ عصر حاضر میں علامہ شبلی نے درس نظامی کے نصاب پر جو

بھرپور تنقید کی۔ اس کی تہہ میں بھی یہ اور اسی قسم کی دوسری نصابی خرابیاں کار فرما تھیں۔ دارالعلوم حیدر آباد کے نصاب کی اصلاح کا کام جب ۱۹۱۷ء میں شبلی مرحوم کے سپرد ہوا تھا تو انہوں نے دیگر سفارشات کے ساتھ ایک سفارش یہ بھی کی تھی کہ قدیم نصاب کی ایسی کتابیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیے گئے ہیں۔ نصاب سے خارج کر دی جائیں اور ہر فن اور ہر علم میں وہی کتابیں رکھی جائیں جن میں صرف اسی فن اور علم پر بحث ہو۔

**توالی مجالس :**

ابن خلدون کا خیال ہے کہ کسی فن کو فاصلے دے دے کر نہیں پڑھانا چاہیے کیونکہ اس طرح اس کے تسلسل کے ٹوٹ جانے کا احتمال رہتا ہے۔ کسی فن میں ملکہ کا حصول اس کی لگاتار اور مسلسل تعلیم کا محتاج ہے۔ اسی چیز کو ابن خلدون نے توالی مجالس کا نام دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب لینا کہ جب کوئی فن شروع کیا جائے تو اس کو ختم کیے بغیر دم نہ لیا جائے اور نہ اس اثنا میں کوئی اور علم پڑھایا جائے، درست نہیں۔

یہ تو خود علامہ کے دوسرے نظریات تعلیم کو جھٹلانے کے مترادف ہوگا۔ دراصل ابن خلدون نے یہاں اس بات پر زور دیا ہے کہ کسی فن یا موضوع کو شروع کرنے کے بعد اس کے مختلف اجزاء کی تدریس میں لمبے لمبے وقفے دینا اصول کے منافی ہے کیونکہ ایسے اقدام سے پڑھا ہوا حصہ وقفہ آ جانے کی وجہ سے بھول جاتا ہے اور ہر مرتبہ موضوع کو نئے سرے سے بالکل ایسے شروع کرنا پڑتا ہے جیسے وہ موضوع کبھی پڑھایا ہی نہ گیا ہو۔

**تفریق مجالس :**

تفریق مجالس توالی مجالس کی ضد ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ابن خلدون علم کو مختلف مجلسوں میں بانٹنے اور کسی موضوع کو بے ہنگم وقفوں سے پڑھانے کے مخالف ہے۔ طالب علم کو انتشار ذہنی اور بھول چوک سے بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اوائل بحث

اور اواخر بحث میں ربط قائم رہے اور ہر موضوع کی تدریس ایک خاص تسلسل کے ساتھ رواں دواں آگے بڑھتی رہے۔

**تعلیم اور سزا :**

جس دور میں ہمارے معلمین اخلاق ''جور استاد به ز مہر پدر،، کہہ کر خستہ حال اور مظلوم بچوں کی ڈھارس بندھایا کرتے تھے اور جبکہ مغرب میں کلیسائی نظام میں پروان چڑھنے والے بچوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جاتا تھا کہ یہ فطری طور پر بد فطرت اور گمراہ ہوتے ہیں اور ان کی اصلاح مار پیٹ کے سوا ممکن ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ جو بچے زجر و توبیخ سے راہ راست پر نہ آئیں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ عین اسی دور میں ہمارا مفکر تعلیم جسے بلاشبہ مجتہد کا درجہ حاصل ہے سزا کے خلاف پورے زور سے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور اپنے دعوے کے لیے ایسے عمدہ دلائل و براھین پیش کرتا ہے کہ باید و شاید۔

ابن خلدون بچوں کی همه گیر نشو و نما کا قائل ہے۔ وہ بچوں کی معقول تربیت پر بڑا زور دیتا ہے۔ لیکن وہ اس بات کا سخت مخالف ہے کہ ان کی تربیت کے دوران ان پر کسی قسم کا تشدد روا رکھا جائے، تشدد خواہ اساتذہ کی طرف سے ہو یا ماں باپ کی طرف سے۔ اس سے بچے کے اخلاقی اور عقلی شرف کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ابن خلدون ایک نفسیاتی نکتہ کی توجیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب بچہ فطری طور پر تربیت حاصل کرنے کی طرف مائل ہو تو پھر اس کے طبعی میلان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تربیت کیوں نہ کی جائے اور اسے خواہ مخواہ تشدد کا نشانہ کیوں بنایا جائے۔

ابن خلدون سے قبل اگرچہ محمد بن ابی زید نے ''حکم المعلمین والمتعلمین،، میں بچوں پر شفقت کرنے کا مشورہ دیا تھا اور امام غزالی بھی احیاء العلوم میں اساتذہ کو یہی پیغام دے چکے تھے کہ وہ تعلیم و تدریس کے دوران حتی الامکان سزا دینے سے گریز کریں اور شفقت کو اپنا لائحہ عمل بنائیں، لیکن جس انداز سے ابن خلدون نے

اساتذہ اور والدین کو تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک سختی اول تو بچوں کو اپنے ماں باپ اور اساتذہ کے خلاف بغض پر آمادہ کرتی ہے اور پھر یہی بغض درس علم اور پورے عمل تعلیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس سختی سے بچنے کے لیے بچے جھوٹ، حیلے اور نفاق سے کام لینے لگتے ہیں اور یہی مکر و فریب کی عادت رفتہ رفتہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔

ابن خلدون کی رائے میں سختی کبھی بھی بڑے، آزاد اور باعمل اشخاص پیدا نہیں کر سکتی بلکہ اس کے برعکس یہ تنگ نظر، ذلیل اور پست انسانوں کو جنم دیتی ہے۔ تعلیم میں سختی و تشدد برتنا تو خود استاد کی اپنی نااہلی کی دلیل ہے۔ ''اس سے طلباء کی طبیعت بجھ جاتی ہے۔ دل سے امنگ، خوشی اور بشاشت دور ہو جاتی ہے۔ طبیعت میں کسالت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بے حمیتی اور بے غیرتی کے جراثیم جنم لیتے ہیں حتیٰ کہ اپنی جان اور اپنے گھر والوں کی محافظت کا مادہ تک اڑ جاتا ہے اور انسان ناکارہ ہو کر دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے۔ اس میں نہ فضائل سیکھنے کا شوق باقی رہتا ہے اور نہ خلق جمیل پیدا کرنے کی امنگ، غرض وہ انسانیت کے جوہروں کو بھول بیٹھتا ہے اور رذائل کا خوگر ہو کر اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے''۔

ابن خلدون یہاں ایک بڑی دلکش چٹکی لیتا اور حکومت پر طنز کرتا ہوا کہتا ہے کہ کیا حکومت کی سختی کی برائی کافی نہیں ہے کہ ہم اس پر ایک اور برائی کا اضافہ کریں۔ ابن خلدون کی رائے میں سختی سے صرف افراد ہی اس حال کو نہیں پہنچتے بلکہ قوموں کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ تاریخ کی طرف ہماری توجہ دلاتے ہوئے ابن خلدون کہتا ہے کہ ان قوموں کے حالات پڑھیے جو ہمیشہ محکوم رہیں اور طرح طرح کے مظالم اور سختیاں برداشت کرتی رہیں۔ کیا ان میں علو عزائم اور کردار کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ یہی حال ان طلباء کا ہے جو اساتذہ کے قہر و جبر کا تختۂ مشق بنے رہتے ہیں۔ جو بات قوموں

کے حق میں صحیح ہے وہ طلباء کے حق میں بھی صحیح ہے۔ اگر آزادی کی فضا میں تعلیم کے مشغلے کو جاری رکھا جائے اور طلباء پر اساتذہ کا غیر ضروری اور غیر اخلاقی دباؤ نہ ہو تو ان میں اونچے قسم کے جذبات پیدا ہوں گے۔

آخر میں ابن خلدون نے اپنے اس بیان کی تائید میں محمد بن ابی زید اور حضرت عمرؓ کے اقوال کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جس کو شریعت مؤدب نہیں بناتی خدا کرے وہ کبھی ادب سے بہرہ مند نہ ہو''۔ یعنی شریعت نے اخلاق کا جو سانچہ بنایا ہے وہ ادب سکھانے کے لیے کافی ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے ادب اور سلیقہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس پر بھی ادب نہیں سیکھ پاتا تو اس کا ادب سے محروم رہنا ہی بہتر ہے۔

## تالیفات کی کثرت:

ابن خلدون کے دور میں نصاب تعلیم کا ایک بہت بڑا نقص یہ تھا کہ علم کی ایک ایک شاخ اور فن کے ایک ایک پہلو پر بے شمار کتابیں تھیں اور وہ سب کی سب نصاب میں شامل سمجھی جاتی تھیں اور جب تک ایک طالب علم ان تمام کتابوں کو پڑھ نہ لیتا، بلکہ یہ کتابیں اسے ازبر نہ ہو جاتیں اس وقت تک اسے دستار فضیلت عطا نہ ہوتی تھی۔ یہ سب کتابیں اگر اپنے فن میں تخلیق کا رتبہ رکھتی ہوتیں تو کوئی بات بھی تھی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان کتابوں کی حیثیت حواشی اور شرحوں کی تھی۔ ایک ہی کتاب کی کئی شرحیں لکھی جاتی تھیں۔ پھر ان شرحوں کی شرحیں اور علیٰ ھذالقیاس حاشیہ نویسی کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ حواشی کی یہ کثرت طلباء کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ وہ مجبور تھے کہ مختلف کتابوں کے متون و حواشی کا رٹا لگائیں اور ان تمام اصطلاحات کو سمجھیں جو مختلف مؤلفین کے ہاں اپنے خاص انداز اور مفہوم میں استعمال ہوئی ہیں۔

ابن خلدون نے اس سلسلے میں فقہ مالکی کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے حفظ و استحضار کی تکلیف دی

جائے تو اسے پہلے تو ان تمام کتب مدونہ کا مطالعہ کرنا ہوگا جو اس سلسلے میں لکھی گئی ہیں ۔ اس کے بعد اس کی متعدد شرحوں میں نظر دوڑانا ہوگی، جیسے کتاب ابن یونس لخمی اور ابن بشیر کی تصنیف، ان کے بعد ان تنبیہات اور مقدمات کا مرتبہ ہے جو ان شرحوں کے غوامض کو حل کرنے کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں ۔ اس طرح ابن الحاجب کی کتاب اور اس کی تمام شرحوں کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ فقہ مالکی کی تعلیم میں قیروانی مدرسۂ فکر کیا روش اختیار کرتا ہے اور بغداد و مصر میں اس کا کیا انداز اور ڈھنگ ہے ۔ اسی سلسلے میں متقدمین اور متاخرین کے نقطۂ نگاہ کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا ۔ ابن خلدون نے نحو اور علوم عربیہ کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے ایک طالب علم کو کتاب سبویہ پڑھنا پڑے گی، اس کے بعد اس کی شرحوں کی باری آئے گی اور پھر ان اختلافات کو یاد رکھنا پڑے گا جو بصرہ، کوفہ، بغداد اور اندلس میں ابھرے اور اس کے بعد متقدمین اور متاخرین کی بحثوں کا مطالعہ بھی لازم ہوگا ۔ ابن خلدون کے خیال میں ان سب پر حاوی ہونا اور کمال حاصل کرنا بے حد کٹھن کام ہے ۔ اس لیے اگر صرف ضروری مسائل کے حفظ و استحضار پر زور دیا جائے تو تعلیم کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے ۔ ابن خلدون کی رائے میں ایک ہی فن میں بہت سی کتابوں اور شرحوں کا لکھا جانا اس لیے بھی بے کار تھا کہ سب کا مطلب ایک ہوتا تھا اور طلباء کو محض لفظی بیانات اور اصطلاحات کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر انہیں پریشان کرنا مقصود ہوتا تھا ۔ اسی لیے ابن خلدون نے کہا ہے :

''یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں اور مطلب ایک ہے اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے اور عمر ایک ہی کے حفظ کرنے میں صرف ہو جاتی ہے ۔''

غالباً شرحوں اور حواشی کی اسی کثرت اور طوالت سے بچنے کے لیے درس نظامی میں جس کے بانی ملا نظام الدین مرحوم اور ان کے والد مولوی قطب الدین تھے، ہر فن کی دو ایک مختصر کتابیں نصاب میں

شامل کر لی گئیں اور باقی شرحوں کو خارج از نصاب کر دیا گیا۔ لیکن اس اصلاح کے باوجود جو کتابیں درس نظامی میں چھٹ چھٹا کر باقی رہ گئیں وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہیں، مثلاً نحو میں، نحو میر، کافیہ، شرح جامی اور شرح مائتہ عامل اور صرف میں میزان، صرف میر، پنج گنج یا منطق میں صغریٰ، کبریٰ، تہذیب، شرح تہذیب وغیرہ۔ درس نظامی ھی کے نصاب سے اندازہ لگایا جا سکتا ھے کہ ابن خلدون کے زمانے میں نصاب شرحوں اور حواشی کے لحاظ سے کس قدر بوجھل ہوگا۔

**تالیفات کا اختصار:**

ابن خلدون کے نزدیک جس طرح تالیفات کی کثرت مانع تحصیل علم ھے اسی طرح تالیفات کا اختصار بھی علم حاصل کرنے کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ھے۔ اس زمانے میں جہاں شرحیں اور حواشی لکھنے کا بڑا شوق تھا وہاں ایسے علماء بھی تھے جو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے شائق تھے۔ بالخصوص متاخرین کے ھاں یہ رجحان عام ہو گیا تھا کہ علوم کے پھیلاؤ کو اتنا سکیڑ دیا جائے اور ہر ہر فن کے مسائل و دلائل کو اس طرح کم سے کم الفاظ میں لکھ دیا جائے کہ عبارات کے حفظ کر لینے میں آسانی ہو، چنانچہ بڑی بڑی اھم بنیادی کتابوں کو الفاظ و عبارات کا نہایت ھی تنگ جامہ پہنایا گیا، جیسے منطق میں خوانجی، فقہ میں ابن الحاجب اور عربیت میں ابن مالک۔ اس اختصار سے کتابیں لسانی معیار سے گر گئیں اور عبارت زیادہ گنجلک اور پیچیدہ ہو گئی۔

ابن خلدون کے نظریے کے مطابق طالب علم کو جو بات مبسوط اور مفصل بیانات سے حاصل ہو سکتی ھے، وہ مختصر خلاصوں سے نصیب نہیں ہو سکتی۔ مبسوط کتابوں میں خوبی یہ ہوتی ھے کہ علمی مسائل و مطالبات بار بار آتے ھیں اور بالتفصیل آتے ھیں اور اس طرح ایک ھی چیز کے بار بار نظر سے گذرنے سے اس میں ملکۂ تام پیدا ہو جاتا ھے۔ مختصرات سے چونکہ یہ بات میسر نہیں آتی، اس لیے اس سے ملکۂ کامل پیدا نہیں ہوتا بلکہ علم ناقص اور ادھورا رہتا ھے۔

کتابوں کے اختصار سے ایک خرابی یہ بھی پیدا ہو گئی کہ فن کے انتہائی مسائل کو مبتدی کے سامنے پیش کیا جانے لگا حالانکہ اس کی محدود علمی صلاحیتیں ان تفصیلات اور باریک نکات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں ۔ ایسی کتابوں کے مصنفین نے تو بڑی نیک نیتی سے یہ چاہا تھا کہ کتابوں کو مختصر کرکے طلباء کے لیے متن کو یاد کرنے اور اس کو بیان کرنے میں آسانیاں پیدا کر دی جائیں ۔ لیکن ہوا یہ کہ طلباء ایک مصیبت میں پھنس گئے اور ان میں ملکۂ علمی پیدا نہ ہو سکا ۔

ابن خلدون کے اس بیان کے پیش نظر کہ تالیفات کی بے جا کثرت یا حد درجہ اختصار مانع علم ہے ۔ ہمیں اپنے نصاب تعلیم کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کہیں ایسے فضول حواشی اور شرحیں تو طلباء کی توجہ کا مرکز نہیں بنی ہوئی جو انہیں ملکۂ علمی حاصل کرنے سے باز رکھیں اور کیا ایسے خلاصے اور خلاصوں کے خلاصوں کا چلن تو نہیں ہو گیا جو طلباء کو اصل کتابوں سے بے نیاز کرنے کا دعویٰ کرتے ہوں ۔

**علوم آلیہ کا مقام :**

ابن خلدون کے دور میں نصاب تعلیم میں ایک بڑی خامی یہ بھی تھی کہ اضافی علوم کو اصل یا مقصود علوم پر فوقیت دی جانے لگی تھی ۔ مدارس اسلامی کے نصاب کا جائزہ لینے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس میں کچھ علوم تو ایسے ہیں جن کا حاصل کرنا مقصود بالذات ہے ۔ مثلاً علم قرآن و تفسیر ، حدیث وغیرہ اور کچھ علوم ایسے ہیں جن کی تحصیل مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ اس لیے نصاب میں شامل ہیں کہ ان کی تعلیم سے مقصود بالذات علوم کی تحصیل میں مدد ملتی ہے ۔ گویا ان علوم کو وسیلے یا آلے کی حیثیت حاصل ہے ۔ مثلاً عربی ادب ، نحو ، صرف وغیرہ کا علم ، علوم شرعیہ کے لیے اور منطق کا علم فلسفہ کے لیے ۔

ہم اگر اسلامی مدارس کے نصاب کا تنقیدی جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ علوم آلیہ کی اتنی کتابیں نصاب میں شامل ہیں اور ان

کی طرف اس قدر وقت دیا جاتا ہے کہ انہیں علوم مقصود بالذات سے بھی اونچا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون کے خیال میں ایسا کرنا مقصود سے سراسر ناانصافی ہے کیونکہ علوم آلیہ کو طول دینا علوم مقصودہ سے انحراف اور کم توجہی کے مترادف ہے اور ہر دو میں یکساں ملکہ حاصل کرنے میں عمر وفا نہیں کرتی۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ ہم نحو، منطق اور اصول فقہ میں بات سے بات نکالتے چلے جائیں اور یوں رائی کا پہاڑ بناتے رہیں۔ ہمیں چاہیے کہ علوم آلیہ کو بے جا وسعت نہ دیں، بلکہ شاگرد کو صرف اس کی غرض و غایت سمجھا دیں اور بس، اگر طلباء انہی مسائل میں اپنی عمر ضائع کر دیں گے تو اصل مقصد تک کیونکر پہنچیں گے۔

**ذریعۂ تعلیم :**

ہمارے ملک میں پچھلے کئی سال سے ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بنا رہا ہے اور خدا خدا کر کے اب کہیں یہ مسئلہ سلجھتا نظر آ رہا ہے۔ ذریعۂ تعلیم کے بارے میں ابن خلدون نے چودھویں صدی عیسوی ہی میں بڑی وضاحت سے کہہ دیا تھا کہ تمام علوم کو سب سے پہلے طلباء کی اپنی اصلی زبان یعنی ان کی مادری زبان میں پڑھانا چاہیے کیونکہ اجنبی زبان میں تعلیم صرف نصف تعلیم کے مترادف ہے۔

**دو زبانوں کی تدریس :**

ابن خلدون نہ صرف مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں ہے بلکہ وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ دو زبانیں ساتھ ساتھ نہیں پڑھانی چاہئیں کیونکہ دونوں زبانوں میں ایک ساتھ کافی مہارت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ عصر حاضر کے بعض ماہرین تعلیم و لسانیات شاید ابن خلدون کے ہمنوا نہ ہوں، اس لیے کہ ایسے تجربات بھی ہوئے ہیں جن میں بچوں کو دو زبانیں ساتھ ساتھ سکھائی گئیں، اور انہوں نے دونوں میں مہارت حاصل کر لی۔ لیکن یہاں اصل مسئلہ ماحول کا ہے۔ اگر بچے کے ماحول میں دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں اور

اسے دونوں زبانیں بولنے کے برابر مواقع میسر آتے ہیں تو اس کے لیے ہر دو زبانوں میں مہارت حاصل کر لینا ممکن ہوگا۔

**تدریس قواعد :**

ابن خلدون کی رائے میں لغت کو تحصیل علم میں بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن وہ نحو اور بلاغت کو نظری طور پر پڑھانے کا مخالف ہے۔ اس کے خیال میں نحو اور بلاغت ایک قسم کا فلسفۂ لغت ہے اور بچے کو اسی وقت پڑھانا چاہیے جب وہ سن رشد کو پہنچ جائے۔ ابن خلدون اپنے دور کے معلمین کے طرز عمل پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دور اندیش معلمین تو بچے کو پہلے زبان کی تعلیم پر لگاتے ہیں اور نحوی اس کے برعکس پہلے قوانین نحویہ رٹاتے ہیں۔ مگر درحقیقت معلمین کا نقطۂ خیال صائب ہے کیونکہ مذکورہ لسانی ملکہ زبان ہی کی تعلیم میں مشغول رہ کر حاصل ہوتا ہے۔ البتہ نحو انسان کو زبان سے قریب تر کر دیتی ہے۔

ابن خلدون نے کہا ہے کہ تدریس زبان کی اصل غایت یہ ہے کہ بچہ اپنے ما فی الضمیر کو بیان کر سکے اور جو کچھ پڑھایا جائے اس کو سمجھ سکے۔ تدریس زبان اور تدریس قواعد کے بارے میں ابن خلدون کے نظریات بڑے حقیقت پسندانہ ہیں اور آج کے ماہرین تعلیم و لسانیت اس بات پر متفق ہیں کہ تدریس قواعد کو تدریس زبان کی بنیاد بنانا ایک بہت بڑی بھول ہے۔ بلکہ بڑی جماعتوں میں بھی گرامر کو نظری طور پر پڑھانا اصول تعلیم کے منافی ہے۔ ابن خلدون کا ایک ایسے دور میں جب کہ قواعد کو مرکز تدریس زبان سمجھا جاتا تھا اور طلباء کی ساری قوتیں صرف کو رٹنے اور نحو کو ذہن نشین کرنے میں صرف ہو جایا کرتی تھیں، ایسا انقلابی مشورہ دینا اس کی حد درجہ تعلیمی بصیرت کا بین ثبوت ہے۔

**لسانی ملکہ :**

تدریس زبان ہی کے بارے میں ابن خلدون نے ایک اور بڑی پتے کی بات کہی ہے وہ یہ. کہ جو زبان بچہ پہلے سیکھے گا، اسی میں اسے

ملکہ لسانی حاصل ہوگا۔ دوسری زبان سیکھنے کی صورت میں ویسا ملکہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ ابن خلدون کی یہ رائے اُس کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"دیکھ لیجیے کہ جس کو عجمی زبان کا ملکہ حاصل ہوتا ہے اس میں عربی زبان کا ملکہ ہمیشہ ناقص اور ادھورا ہی رہتا ہے۔ مثلاً پارسی، بربری، رومی اور فرنگی جیسی عجمی قومیں، عربی میں ملکہ پیدا کرنے کے لیے خواہ کتنا ہی سر ٹپکیں اور زور ماریں، کمال پیدا نہیں کر سکتیں، اور مشکل سے اپنی خامی و کوتاہی کو دور کر سکتی ہیں اور یہ اس لیے کہ ان کی ذاتی زبانوں کے ملکے، عربی میں ملکہ حاصل کرنے سے باز رکھتے ہیں اور ان کو درجۂ کمال تک نہیں پہنچنے دیتے"۔

ابن خلدون کی یہ رائے بڑی ہی وقیع ہے۔ اس نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں عام صنعتوں کی مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً ایک درزی اپنا فن سیکھنے کے بعد فن عمارت گری میں کمال حاصل نہیں کر سکتا، اور اسی طرح ایک ماہر عمارت گر اچھا درزی نہیں بن سکتا۔ علامہ کے نزدیک زبان سیکھنا بھی ایک صنعت ہے اور دوسری صنعتوں کی طرح اس میں مہارت پیہم اعادے اور تکرار کی محتاج ہے اور لسانی ملکات مشق و ریاضت سے حاصل ہوتے ہیں۔ عصر حاضر کے ماہرین لسانیات بھی تو یہی کہتے ہیں کہ تحصیل زبان عادات لسانی پیدا کرنے سے عبارت ہے اور جب کوئی انسان ایک قسم کی لسانی مہارتیں حاصل کر لیتا ہے تو پھر دوسری زبان کی لسانی مہارتیں اسی کمال سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تدریس زبان کے اصولوں میں قانون مشق کو ایک مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ابن خلدون نے عربی میں ملکہ حاصل کرنے کا ایک گر یہ بتایا ہے کہ کلام عرب زیادہ سے زیادہ یاد کیا جائے۔ جس قدر زیادہ اور بلند کلام یاد ہوگا، اسی قدر ملکۂ لسانی نکھرتا اور سنورتا چلا جائے گا۔ ملکہ کی خوبی و برتری یاد کیے ہوئے کلام کی بزرگی و برتری پر مبنی ہوگی۔ ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ طبیعت یاد کیے ہوئے کلام

سے رنگ چراتی ہے اور قوائے ملکیہ اس سے غذا حاصل کرتے ہیں ۔ اگر اشعار یاد کیے جائیں گے تو شعر گوئی کا ملکہ جلا پائے گا اور نثر پارے یاد ہوں گے تو اس سے قوت انشاء میں نکھار آئے گا ۔ ابن خلدون کے خیال میں قرآن ، حدیث اور زمانہ جاہلیت کی شاعری ایسے خزانے ہیں کہ ان کو یاد کر لینے سے آدمی عربی زبان میں کمال حاصل کر سکتا ہے ۔

شعر گوئی کا ملکہ حاصل کرنے کے لیے صاحب چہار مقالہ ، نظامی عروضی سمرقندی نے بھی نوواردان فن شعر کو کچھ اسی قسم کا مشورہ دیا تھا کہ متقدمین و متاخرین کے ہزاروں شعر یاد کریں تاکہ ان کے کلام میں پختگی اور نفاست پیدا ہو سکے ۔ بلاشبہ شعر گوئی ایک فطری اور وہبی ملکہ ہے اور اس کے لیے ایک خاص مزاج اور موزونی طبع درکار ہے ۔ یہ چیزیں نہ ہوں تو محض اشعار کا یاد کرنا بے کار ہوگا لیکن اگر شعر گوئی کا فطری رجحان موجود ہو تو اشعار کا مطالعہ اور ان کا یاد کرنا یقیناً کلام کے سنوارنے اور نکھارنے کا باعث بن سکتا ہے اور سچ پوچھیے تو ہزاروں کی تعداد میں اشعار موزونیٔ طبع کے بغیر بھلا کیونکر یاد ہو سکتے ہیں ۔

**علم اور سفر :**

ابن خلدون کے زمانے میں دور دراز کے سفر اختیار کیے بغیر علم کی تکمیل ناممکن تھی ۔ اس لیے اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ علم کی خاطر ترک وطن اور مشائخ زمانہ سے ملاقات علم کو چار چاند لگا دیتے ہیں ۔ انسان علوم ، اخلاق اور فضائل کتابوں کے مطالعہ سے بھی سیکھ سکتا ہے ۔ لیکن اساتذہ سے بالمشافہہ گفتگو اور صحبت و تلقین سے جو بات حاصل ہوتی ہے وہ طبیعت میں پختہ طریقے سے بیٹھ جاتی ہے اور دل میں گھر کر لیتی ہے ۔ ابن خلدون کے خیال میں اساتذہ کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر شاگرد کے لیے ملکات علمی کا حصول بیشتر اور راسخ تر ہو جائے گا ۔ متعدد مشائخ سے ملاقات کرکے طلباء رنگ رنگ کے طریقہ ہائے تعلیم اور اسالیب تدریس سے واقف ہو جاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ اصطلاحات محض تعلیم کے طریقوں اور وسیلوں کی حیثیت رکھتی ہیں اس سے زائد ان کی کوئی حقیقت نہیں ۔

یہ ہیں وہ تعلیمی نظریات جنھیں ابن خلدون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''مقدمہ،، میں بیان کیا ہے اور جن کے مطالعہ کے بعد ابن خلدون کی علمی سوجھ بوجھ اور لامحدود تعلیمی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

**کتابیات :**


۱ - ابن خلدون : ''مقدمہ،، (اردو ترجمہ از مولانا سعد حسن خاں یوسفی) نور محمد۔ اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ ، کراچی۔

۲ - طٰہ حسین ڈاکٹر : ''ابن خلدون،، (اردو ترجمہ از مولانا عبد السلام ندوی) مطبع معارف اعظم گڑھ ، ۱۹۴۰ء

۳ - عیساوی چارلس : ''An Arab Philosophy of History،، عرب فلاسفی آف ہسٹری

۴ - عنان ، محمد عبداللہ : ''ابن خلدون،،
Ibn Khuldan, his Life and Work
شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۴۶ء

۵ - ندوی ، محمد حنیف : ''افکار ابن خلدون،، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، لاہور، ۱۹۵۴ء


---

# طلباء اور اساتذہ کے لیے*
# درسی کتاب کی اہمیت

یوں تو درسی کتاب کو پوری قومی زندگی میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور ہمارے ملک کے خواندہ، ناخواندہ سبھی افراد کو بلاواسطہ یا بالواسطہ درسی کتابوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن درسی کتاب کا جو رشتہ طالب علم اور استاد کی ذات سے ہے وہ کسی اور سے نہیں۔ اس لیے کہ درسی کتابیں طلباء اور اساتذہ ہی کے لیے لکھی جاتی ہیں - یہی لوگ اسے اول تا آخر پڑھتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو کتاب کے حسن وقبح سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں - اسی لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آج کی نشست میں، میں یہ بیان کروں کہ ایک درسی کتاب طالب علم اور استاد کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور اساتذہ اور طلباء درسی کتابوں سے کیا کیا توقعات وابستہ کرتے ہیں - البتہ یہ بات کہ موجودہ درسی کتابیں ان توقعات پر پورا اترتی ہیں یا نہیں اور اگر نہیں تو کیوں، میرے موضوع سے خارج ہے - ہاں، اگر میری گذارشات کی روشنی میں کسی درسی کتاب کے بارے میں آپ از خود کوئی فیصلہ کر لیں تو مجھے اس پر اعتراض نہ ہوگا - لیکن مجھ مضمون نگار کا اس فیصلہ سے متفق ہونا لازم نہیں بالکل اسی طرح جس طرح کسی جریدے یا روزنامے کے مدیر کے لیے مراسلہ نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا -

کہا جاتا ہے کہ طالب علم کے لیے کتاب ایک بہت بڑے سہارے کا حکم رکھتی ہے - کتاب موجود ہو اور استاد غائب ہو، تو طلباء کتاب کی مدد سے تھوڑا بہت علم حاصل کر لیتے ہیں - بلکہ

---

* یہ مقالہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے مذاکرے منعقدہ ۱۹۷۱ میں پڑھا گیا -

وہ لوگ جو پرائیویٹ امتحان پاس کرنے کے فن سے شناسا ہیں ، ان کے لیے تو سبھی کچھ کتاب ہی ہوتی ہے ۔ لیکن اگر استاد موجود ہو اور کتاب غیر موجود تو پھر استاد شاگرد دونوں کمرہ جماعت میں بیٹھ کر کتاب کا انتظار کرتے ہیں اور شاید ٹیکسٹ بک بورڈ کو صلواتیں بھی سناتے ہیں ۔ یقین نہ آئے تو ایک واقعہ سن لیجیے ۔

اب سے تین سال پہلے کی بات ہے کہ محکمہ تعلیم نے پی ۔ ٹی ۔ سی کا جسے پہلے نارمل یا جے ۔ وی بھی کہا جاتا تھا ۔ نصاب بدل دیا ۔ نصاب کی تبدیلی کے ساتھ ہی نئی کتابیں لکھنے کا حکم ہوا ۔ نصاب تو ستمبر ۱۹۶۸ء سے رائج کر دیا گیا ۔ داخلے بھی مکمل ہو گئے لیکن کتابیں لکھنے اور چھپنے میں چند ماہ کی تاخیر ہو گئی ۔ انہی دنوں مجھے سرکاری حیثیت سے کئی نارمل سکول دیکھنے کا اتفاق ہوا ، اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہر جگہ استاد اور شاگرد دونوں بیٹھے محاورے میں مکھیاں مار رہے ہیں ۔ اگر سچ مچ کی مکھیاں مارتے تو شاید کوئی قومی خدمت ہوتی لیکن ان کا یہ اقدام تو قومی ضیاع کے مترادف تھا ۔ میں نے اس صورت حال کی وجہ دریافت کی تو استاد اور شاگرد بیک زبان نہیں ، بیک آواز بولے جناب درسی کتاب تو ہے نہیں ۔ مکھیاں نہ ماریں تو اور کیا کریں ۔ محکمے نے آپ کا لکھا ہوا ایک صحیفہ "رہنمائے معلم امام" مفت بھیج رکھا ہے ۔ صبح گھنٹہ بھر اس کی تلاوت کرتے ہیں اور باقی وقت وظیفے کی رقم میں اضافے ، امتحانات کے التوا بلکہ تنسیخ اور کتابوں کی اشاعت میں تعجیل کے مطالبوں میں گزارتے ہیں ۔ اس پر رئیس مدرسہ نے گرہ لگائی کہ جو وقت اس کے بعد بھی بچ رہتا ہے وہ ہڑتال کی دھمکیوں کی نذر ہو جاتا ہے ۔ یہاں سامعین کرام کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس کورس کے نصاب کی تفصیلات اساتذہ کے پاس موجود تھیں اور ان میں اکثر استاد ایم ۔ ایڈ تک تعلیم یافتہ تھے ۔

جب سے یہ حادثہ پیش آیا ہے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ نصاب موجود ہو ، استاد بھی حاضر ہو ، لیکن جب تک درسی کتاب نہیں

ہو گی تعلیم کا بازار سرد رہے گا اور ماہرین تعلیم کی یہ رائے کہ کتاب ''قائم مقام'' معلم یا ''نائب استاد'' ہے۔ درست نہیں بلکہ اسے یوں کہنا زیادہ بجا ہوگا کہ کتاب بجائے خود ایک معلم ہے اور استاد اصل معلم نہیں بلکہ کتاب کے مدرس اور شارح کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تو خیر پارسال کی بات تھی۔ حال ہی کا ایک واقعہ سنیے۔ گورنر صاحب دورے پر ملتان تشریف لے گئے تو بی۔ایس۔سی کے طلباء نے شکایت کی کہ جناب یونیورسٹی نے طبیعیات، کیمیا اور ریاضی کا نصاب تو بدل دیا ہے لیکن کتابیں دستیاب نہیں اور اگر یہی صورت حال رہی تو ہم امتحان نہ دے سکیں گے۔ ان کے اساتذہ کرام اور پرنسپل صاحبان نے بھی طلباء کی اس شکایت اور مطالبے کی پرزور تائید کی۔ اور جس طرح غالب کو پانی کا ہوا ہو جانا باور آ گیا تھا اسی طرح درسی کتاب میں ہمارا ایمان اور محکم ہو گیا۔

ابھی کل ہی کی بات ہے مجھے اردو بازار میں پشاور کے صدر شعبۂ ریاضی مل گئے۔ فرمانے لگے کیا بی۔ایس سی کی فلاں کتاب چھپ گئی۔ میں نے کہا ڈمی تیار ہو گئی ہے بس دو چار دن میں بازار میں آ جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگے اب کیا فائدہ، ،ہم نے تو طلباء اور اساتذہ دونوں کے اصرار پر وہ تمام حصے نصاب سے خارج کر دیے ہیں جو اس کتاب سے متعلق تھے۔ یہ تمام واقعات جو میں نے عرض کیے ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پہلی جماعت ہو یا بی۔ایس سی کا درجہ، درسی کتاب کے بغیر بات نہیں بنتی۔ درسی کتاب کے بغیر لڑکے تو لڑکے، استاد بھی اپنے عجز کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور تعلیمی چوکھٹے کی حیثیت اس فریم کی سی ہوتی ہے جس میں ابھی تصویر نہ جڑی گئی ہو۔

ہمارے تعلیمی نظام میں درسی کتاب کو جو اس درجہ اہمیت حاصل ہے وہ اس لیے کہ کتاب طالب علم اور استاد دونوں کے لیے ایک منزل کی نشاندھی کرتی ہے۔ اور اس سے دونوں کی حدود کار

متعین ہو جاتی ہیں اور یوں دونوں ایک طرح کے انتشار ذہنی سے بچ رہتے ہیں ۔ تعلیمی سفر میں کتاب در اصل طالب علم کے لیے ایک پاسپورٹ یا پروانہ راہ داری کی حیثیت رکھتی ہے اور استاد خواہ درسی کتاب کے بغیر بھی طلباء کو پڑھانے کی پوری اہلیت رکھتا ہو۔ طلباء کو استاد کی تدریس اور طریق کار سے کچھ اطمینان نہیں ہو پاتا اور وہ اپنی تعلیم میں ایک ایسا خلا محسوس کرتے ہیں جو ان کے خیال میں صرف درسی کتاب ہی سے پر ہو سکتا ہے ۔

یوں بھی دنیائے علم میں کتاب کو ایک تقدس اور احترام کا درجہ حاصل ہے ۔ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی الہامی کتاب اور صحیفے سے نوازا اور اس کتاب کو دلیل نبوّت ٹھہرایا اور اسے اس نبی کے پیرو کاروں کے لیے درسی کتاب قرار دیا اور اس کی قرأت و تلاوت کو باعث نجات بنایا ۔ تقدس کے علاوہ درسی کتاب کو استاد کا درجہ بھی حاصل ہے نامعلوم کیوں ۔ مدارس میں ہم نے دیکھا کہ اگر استاد کوئی چیز صحیح پڑھا رہا ہو اور کتاب میں وہ غلط درج ہو تو طلباء اکثر و بیشتر کتاب ہی کو زیادہ صحیح سمجھنے کی طرف راغب ہوتے ہیں ۔

طلباء کے لیے کتاب کی اہمیت کچھ اس لیے بھی زیادہ ہے کہ کتاب طالب علموں کی علمی ضروریات کی کفالت کرتی ہے اور ایک خاص درجے کے لیے ایک خاص مضمون کے مطلوبہ مواد کو مناسب ترتیب و تدریج کے ساتھ پیش کر دیتی ہے اور یوں طلباء تعلیمی مواد کے بے جا تکرار اور اعادے سے محفوظ رہتے ہیں ۔ طالب علم خواہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو، اس بات کا وہ از خود فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اسے

کیا پڑھنا ہے ؟

کتنا پڑھنا ہے ؟

اور کب پڑھنا ہے ؟

یہ باتیں بہرحال اسے وہ درسی کتاب بتاتی ہے جو نصاب کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہو۔

کتاب نہ صرف طالب علم کو ضروری مواد تدریس مہیا کرتی ہے بلکہ وہ متعلمین کے لیے ذاتی اکتسابی جائزے میں بھی معاون ہوتی ہے۔ اور طالب علم جوں جوں کتاب کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے اسے ایک احساس تحصیل ، ایک گونہ مسرت اور اطمینان ہوتا ہے اور وہ ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہی درسی کتاب طالب علم کو امتحانات کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں ممد ہوتی ہے اور وہ جانتا ہے کہ درسی کتاب پر اس کو جتنا عبور ہوگا اتنی ہی اس کی کامیابی یقینی اور شاندار ہوگی۔

سامعین کرام میں سے شاید کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ اگر درسی کتاب بجائے خود اتنی اہم ہے تو کیا وجہ ہے کہ درسی کتاب کے مقابلے میں اس کا خلاصہ ، گائیڈ اور شرح نسبتاً زیادہ مقبول ہے۔ یہاں تک کہ بعض امیدوار ان کی موجودگی میں اصلی درسی کتاب سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کیا ان اضافی کتابوں کی مقبولیت سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ طالب علموں کا درسی کتاب پر وہ اعتماد نہیں جس کا اوپر ذکر ہوا یا پھر درسی کتاب ان خوبیوں سے معرّا ہے جنہیں طلباء کی نکتہ رس نگاہیں بالآخر خلاصوں اور گائیڈوں میں ڈھونڈھ نکالتی ہیں۔

صاحبو! یہ اعتراض اپنی جگہ پر بڑا وقیع اور قابل التفات ہے۔ یقیناً ہماری سب کی سب درسی کتابیں مجمع محاسن نہیں اور نہ کسی ادارے کو اس کا دعویٰ ہے۔ ان میں خامیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ پھر بہت سے مواد کو جب ضرورت سے زیادہ اختصار سے بیان کرنے کی پابندی عائد ہو یا اس کی مصلحت متقاضی ہو تو پھر مصنفین پر لازم آتا ہے کہ وہ بعض باتیں تشنہ تشریح چھوڑ دیں اور استاد سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اس تشنگی کو سیرابی میں بدل

دے گا، خلاؤں کو پر کر دے گا اور اس کا ذہن کتاب کی ان تمام دقتوں کو حل کر دے گا جو طلباء کے لیے لاینحل ہیں۔ لیکن چونکہ بہت سے استاد اپنے علم کو درسی کتاب کے علم سے آگے بڑھانا کتاب کی توہین اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں اس لیے طلباء خلاصے کے محتاج ہو جاتے ہیں اور ان کا یہ احتیاج انہیں خلاصوں کا اس قدر مشتاق بنا دیتا ہے کہ وہ کتاب سے بڑھ کر اس کی شرح سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کتاب کو زبان و بیان کی گنجلکوں سے آزاد کر دیا جائے، مشکلات پر قابو پانے کے لیے کتاب میں فرہنگ اور مشقوں کا اضافہ کر دیا جائے اور امتحانی جائزے کے لیے مناسب سوالات بلکہ ان کے جوابات کے لیے اشارات بھی درج کر دیے جائیں تو طلباء ان شرحوں اور رہنما کتابوں سے بالکل بے نیاز ہو جائیں گے اور امتحان کی تیاری میں درسی کتاب بجائے خود ایک اچھی شرح کا کام دے گی——یہ بات بہرحال قابل افسوس ہے کہ جہاں مصنفین اور مؤلفین کتاب کی تصنیف و تالیف میں بڑی محنت سے کام کرتے ہیں، وہاں وہ ہر سبق یا باب کے آخر میں چند مشقیں لکھنے اور سوالات بنانے میں اتنے ہی تساہل اور بے پروائی کا ثبوت دیتے ہیں اور بعض مصنف تو آخری وقت پروف دیکھنے کے دوران ہر باب کے بعد دو چار بے معنی سی مشقیں اور سطحی سے سوالات لکھ دیتے ہیں تاکہ ناقدین کا منہ بند کیا جا سکے۔ حالانکہ ان مشقوں اور سوالات کا معقول، فکر انگیز اور معیاری ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا املا کی صحت یا بیان کردہ خیالات و معلومات کی درستی—— اردو کی درسی کتابوں میں سبق کے آخر میں طالب علم کو جگہ جگہ پر یہ کہنا کہ فلاں پیروں کو سلیس اردو میں بیان کرو اور شعر نمبر ۱، ۳، ۵، ۷، ۹ اور ۱۱ کی تشریح کرو، مشق کا مذاق اڑانے اور اصل سبق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ ایسی ناپختہ مشقیں اور غیر فکر انگیز سوالات دے کر خود مصنف اپنی کتاب کی قیمت گراتا ہے اور تدریسی صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے دیوالیہ پن کا ثبوت دیتا ہے۔

بعض کتابیں یوں بھی چوں چوں کا مربہ نظر آتی ہیں۔ ان کا

مواد حسن ترتیب سے عاری اور لطف بیان سے خالی ہوتا ہے۔ نتیجتاً طلباء کتاب کے ساتھ ساتھ ایک ایسی چیز پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو کتاب کی ان خامیوں کی تلافی کرتی ہے اور امتحان میں کامیابی کے مراحل کو آسان بناتی ہے اور کتاب ہی کے مواد کو زیادہ سلیقے، وضاحت اور منصفانہ انداز میں پیش کرتی ہے۔ بہر حال ان اعتراضات سے کسی درسی کتاب کے معیاری ہونے میں تو شبہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ درسی کتاب کے بغیر بھی تعلیمی قافلہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

یہ درسی کتاب جس کی اہمیت میں آج ہم سب رطب اللسان نظر آتے ہیں، صرف طالب علم ہی کے لیے کوئی اہم اور لائق التفات شے نہیں بلکہ استاد کے لیے بھی یہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہے۔ تربیتی اداروں اور کالجوں کے اساتذہ کی درسی کتاب سے عشق کی کہانی اوپر بیان ہوئی۔ بلاشبہ درسی کتاب استاد کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ کیونکہ یہ اسے تمام ضروری مواد تدریس منتخب اور مرتب صورت میں یکجا پیش کرتی ہے اور اس سے اس کا کام بڑا سہل اور قابل عمل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب پر تنقید کرنے والا استاد، کمرہ جماعت میں بھی اس سے جدا ہونا پسند نہیں کرتا—ہر استاد خود ہر شعبے کا متبحر عالم نہیں ہو سکتا اور نہ وہ ضخیم کتابوں کے مطالعے سے اپنے خاص درجۂ تدریس کے لیے مواد کی موزونیت کا فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ مختلف ذخیروں کو کھنگالے اور علم کے بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کرکے اپنے الفاظ یا اقتباسات کی صورت میں قلم بند کرے—اور اگر بالفرض وہ یہ سب کچھ کرنے پر قادر بھی ہو جائے جب بھی یہ ممکن العمل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اس سے تدریس کی وحدت قائم نہیں رہ سکے گی اور مختلف تعلیمی اداروں میں مواد تدریس کے اعتبار سے یکسانیت اور ہم آہنگی ختم ہو جائے گی اور امتحانی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ایک اچھی درسی کتاب جسے ماہرین علم و تحقیق نے مرتب کیا ہو، ایک اچھے استاد کے لیے علمی اضافے اور تعلیمی

رہنمائی کا وسیلہ بنتی ہے اور ایک عام استاد کے لیے یہ مشعل راہ اور روشنی کے مینار کا کام دیتی ہے۔ ایک اچھی کتاب کے ہوتے ہوئے بھی ہم نے بہت سے اساتذہ کو دوران تدریس قدم قدم پر ڈگمگاتے دیکھا ہے۔ لیکن اگر اس سہارے کو بھی درمیان سے ہٹا دیا جائے تو استاد کا کمرہ جماعت میں کھڑا ہونا بھی محل نظر ہوگا۔

درسی کتاب استاد کو صرف لائحہ عمل ہی مہیا نہیں کرتی بلکہ اسے تدریسی جائزے کی تکنیکوں سے بھی واقفیت دلاتی ہے۔ مزید برآں اگر کتاب میں حوالہ جات کا ذکر ہو اور مزید مطالعے کا شوق دلانے کا اہتمام کیا گیا ہو تو یقیناً اس سے استاد کو اپنا علم بڑھانے میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ تدریس زبان کی کتابوں کے ذریعے زبان کے استاد کے ذوق کی تربیت ہوتی ہے، ادب سے اس کی دلچسپی بڑھتی ہے اور مذاق سخن جلا پاتا ہے۔ درسی کتاب کو تدریس زبان میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں ادب کی تدریس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کلاسیکی اور جدید شعری و نثری ادب کے اقتباسات پیش کیے بغیر بچوں کو اسالیب اور مختلف اصناف سخن سے کیونکر متعارف کرایا جا سکتا ہے اور پھر قرأت، مطالعہ اور تدریس زبان کے دیگر مراحل کیونکر انجام پا سکتے ہیں۔

درسی کتاب کی اہمیت کا ایک اور پہلو بھی لائق التفات ہے اور وہ یہ کہ کتاب اساتذہ اور والدین کے درمیان ایک اہم رابطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کی مصروف زندگی میں جب کہ استاد اور والدین کی بالمشافہہ ملاقات گاہے ماہے بھی ممکن نہیں رہی اور باہمی ابلاغ کا کوئی اور مؤثر وسیلہ بھی کام میں نہیں لایا جا رہا۔ کتاب بڑی خاموشی سے اس اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہے۔ کتاب کے ذریعے والدین کو مدرسہ کی کارکردگی اور استاد کی تدریسی کاوشوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ درسی کتاب ہی کے ذریعے استاد کو والدین کا تعاون حاصل ہوتا ہے اور کتاب کی تدریس میں وہ خلا جو قلت وقت یا دیگر وجوہ کی بنا پر باقی رہ جاتا ہے، والدین کی توجہ اور کوشش

سے پر ہو سکتا ہے۔ اور یوں کتاب گھر اور مدرسے کو قریب تر لانے میں ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔

جہاں درسی کتاب معلم کے ہاتھ میں ایک مؤثر آلے کی حیثیت رکھتی ہے وہاں یہ اپنی موجودہ شکل میں اپنی افادیت کو بڑھانے سے قاصر ہے۔ ہماری کسی بھی درسی کتاب کے ابھی تک معلم ایڈیشن شائع نہیں کیے گئے اور نہ درسی کتاب سے الگ کوئی "رہنمائے معلم" قسم کی چیز مہیا کی گئی ہے۔ درسی کتاب کے معلم ایڈیشن سے میری مراد ایک ایسی درسی کتاب ہے جس میں کتاب کے متن کے ساتھ ساتھ استاد کی رہنمائی کے لیے مناسب ہدایات ہوں اور حل مشکلات بھی۔ نیز ہر سبق کی تدریس کے سلسلے میں استاد سے جن مثالوں، مشقوں، سوالات اور تعلیمی مشاغل وغیرہ کی توقع کی جاتی ہے وہ سب درج ہوں اور مزید مطالعے کے لیے حوالہ جات بھی موجود ہوں تاکہ استاد درسی کتاب کے متن پر خاطر خواہ اضافہ کر سکے اور یوں طالب علم کی اس تشنگی کو دور کر سکے جو کتاب کے اختصار یا اغلاق کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اگر معلم کی گائیڈ بک اور درسی کتاب کے اصل متن کو کتابی شکل میں یکجا کر کے شائع کر دیا جائے تو یہ درسی کتاب کا معلم ایڈیشن کہلائے گا۔ تدریس زبان کے سلسلے میں معلم ایڈیشن کی ضرورت اظہر من الشمس ہے۔ اس لیے کہ ہمارے اساتذہ لسانی سرگرمیوں اور فکر انگیز مشقوں کے اعتبار سے کچھ زیادہ طباع اور ہوشیار نظر نہیں آتے اور بعض اوقات کتاب میں درج شدہ مثالوں اور جملوں کے علاوہ اپنی طرف سے ایک نئی مثال اور ایک نیا جملہ بھی پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی طرح سائنس، معاشرتی علوم اور ریاضی کی تدریس بھی کتابوں کے معلم ایڈیشنوں کی مدد سے زیادہ مؤثر اور بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ اگر ٹیکسٹ بک بورڈ اساتذہ کے لیے درسی کتابوں کے ایسے معلم ایڈیشن شائع کرنے شروع کر دے تو مجھے امید ہے کہ اساتذہ اور ماہرین تعلیم، بورڈ کے اس اقدام کو خوش آمدید کہیں گے اور یہ ایڈیشن اساتذہ کا بہترین رفیق اور مفید دوست ثابت ہوگا۔

---

# درسی کتابوں کا معیار قرأت اور اسکے جانچنے کے طریقے *

سب سے بڑا اعتراض جو درسی کتابوں پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا معیار قرأت (Readability) بچوں کی استعداد قرأت (Reading ability) سے بالعموم بلند ہوتا ہے اور معیار قرأت اور استعداد قرأت میں عدم توازن کی وجہ سے بچے زبان کی مشکل میں اُلجھ کے رہ جاتے ہیں اور مضمون کے مطالب تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ بچوں کی درسی کتابوں میں خواہ وہ اردو زباندانی کی ہوں یا تاریخ اور جغرافیے کی، سائنس کی ہوں یا ریاضی کی، مصنفین طلباء کی استعداد قرأت کو ملحوظ رکھے بغیر عبارت آرائی کے شوق یا بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کے جنون میں مشکل اور غیر مانوس الفاظ ٹھونستے چلے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبارت گنجلک ہو جاتی ہے۔ کتابیں قاری کے فہم سے بلند ہو جاتی ہیں اور پھر یہ تنفر ایک متعدی مرض کی طرح پورے عمل تعلیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

اس مقالے میں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ کسی کتاب کے معیار قرأت سے کیا مراد ہے۔ وہ کونسے عناصر اور عوامل ہیں جو کتابوں کے معیار قرأت کو متعین کرتے اور ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور وہ کونسے طریقے ہیں جن سے ہم کسی کتاب کے معیار قرأت کو پرکھ سکتے ہیں۔

Carter V. Good اپنی تصنیف ''لغات التعلیم'' میں ''معیار قرأت'' کی یوں تعریف کرتا ہے کہ اس سے مراد کسی پارے کی وہ صلاحیت ہے جو اسے قاری کی استعداد قرأت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

---

* یہ مقالہ اردو تدریس کانفرنس دسمبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا۔

Webster کے نزدیک ''معیار قرأت'' سے مراد کسی کتاب یا ادب پارے کا قابل مطالعہ یا ناقابل فہم ہونا ہے اور اس کے مطابق کسی قابل مطالعہ کتاب میں ان تین خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے :

۱۔ خط صاف اور واضح ہو۔
۲۔ کتاب اتنی دلچسپ اور خوش آئند ہو کہ اس کا پڑھنا قاری کے لیے بوجھ نہ ہو۔
۳۔ جس استعداد کے قاری کے لیے لکھی گئی ہو اس کے لیے اس کا پڑھنا سہل ہو۔

گویا خوشخطی ، دلچسپی اور سہولت قرأت کسی کتاب کے معیار قرأت کو متعین کرتے ہیں ۔ کتاب کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، اگر اس کا خط صاف اور واضح نہ ہوگا تو قاری کے لیے اس کتاب کا پڑھنا مشکل ہوگا۔ اسی طرح اگر کتاب بہت عمدہ کتابت اور طباعت کی حامل ہو لیکن اس کا مواد قاری کے ذوق ، اس کے نظریات اور اس کی خواہش کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کرتا تو اس کا پڑھنا بھی قاری کے لیے مشکل ہو جائے گا اور اسی طرح موضوع اور مواد بھی دلچسپ ہو۔ کتابت بھی عمدہ ہو، لیکن الفاظ مشکل اور عبارت گنجلک ہو تو بھی ایسی کتاب قبول خاطر اور قابل فہم نہ ہوگی۔ گویا معیار قرأت صرف واضح خط، سہل زبانی یا دلچسپی سے عبارت نہیں بلکہ معیار قرأت ان تینوں کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ ایک امریکی ماہر تعلیم George Spache معیار قرأت کو ''ادراک پذیری'' کا دوسرا نام سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک اس کا مفہوم کسی کتاب کا درجہ اشکال Difficulty level ہے ۔ ہر کتاب جو پڑھنے والے کی استعداد قرأت کے مطابق لکھی جائے گی وہ معیار قرأت کے لحاظ سے عمدہ اور معیاری کتاب سمجھی جائے گی اور اس کا درجہ اشکال وہی ہوگا جو قاری کا درجہ قرأت ہے ۔

**معیار قرأت پر اثر انداز ہونے والے عوامل :**

سب سے پہلا شخص جس نے اس موضوع کو اپنی توجہ اور مطالعے

کا مرکز بنایا وہ ایک روسی ماہر لسانیات Rubakin تھا۔ اس محقق نے روسی ادب اور روسی زبان کے مطالعے کے بعد یہ پتہ چلایا کہ کسی کتاب کے معیار قرأت کو بڑھانے یا گھٹانے میں ان دو عناصر کا ہاتھ ہے۔

اول : ناخواندہ اور غیر مانوس الفاظ (Unfamiliar words)

دوم : لمبے لمبے فقرے جبکہ وہ ایک کثیر تعداد میں ہوں۔

اس کے بعد شرمین (Sherman) ایک امریکی محقق نے Rubakin کے اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ جملے کا اختصار اور لمبائی علی الترتیب عبارت کی تسہیل اور اشکال پر منتج ہوتے ہیں یعنی جس عبارت میں جملے چھوٹے ہوں گے وہ زیادہ قابل فہم ہوگی بہ نسبت اس عبارت کے جس کے جملے لمبے ہوں گے۔ ایک اور امریکی ماہر لسانیات کٹسن (Kittson) نے اس نظریے کو امریکی روزناموں اور رسالوں پر آزمایا اور اس نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ صرف جملوں کی لمبائی ہی عبارت کو مشکل نہیں بناتی بلکہ کثیر الحرفی مرکبات بھی معیار قرأت کو متاثر کرتے ہیں۔ اس میدان میں جن امریکی ماہرین علم اللسان نے باقاعدہ علمی اور سائنسی انداز میں تحقیق کی ہے ان میں گرے (Gray) اور لیری (Leary) کا نام سر فہرست آئے گا۔ ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ معیار قرأت صرف نامانوس الفاظ اور فقروں کی لمبائی سے عبارت نہیں بلکہ معیار قرأت پر اثر انداز ہونے والے یہ چار عناصر ہیں :

۱ - موضوع -

۲ - انداز بیان -

۳ - فقروں کی بندش اور ساخت -

۴ - کتاب کی ترتیب و تنظیم -

Ruth Strang نے اس موضوع پر تحقیق کرنے کے بعد انہی چاروں عوامل کی تائید کی۔ البتہ سٹائل اور انداز کو سر فہرست رکھا اور موضوع کو جو Gray اور Leary کی تحقیق میں سرفہرست تھا، دوسرا درجہ دیا۔ دو اور امریکی ماہرین تعلیم Morris اور Holverson اسی موضوع پر کام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف الفاظ

کا اشکال ''معیار قرأت'' کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اصل چیز ان کا محل استعمال ہے ۔ ان محققین نے خیال ظاہر کیا کہ معیار قرأت کا تخمینہ لگاتے وقت ذخیرہ الفاظ کو دو شعبوں میں تقسیم کر لینا چاہیے :

۱ ۔ ایسے الفاظ جو محض اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوئے ہوں ، اور

۲ ۔ ایسے الفاظ جو کسی پورے خیال کی ترجمانی کرتے ہوں اور سیاق و سباق میں ایسے معنی دیتے ہوں ، جو عام معنوں سے قدرے یا بالکل مختلف ہوں ۔

کولمبیا یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے سابق صدر Irving Lorge کی تحقیق کے مطابق مشکل الفاظ اور جملے کی لمبائی صرف یہی دو بنیادی عناصر ہیں جو معیار قرأت کو زیادہ تر متاثر کرتے ہیں ۔ باقی عناصر بلاشبہ معیار قرأت پر کسی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت محض ضمنی یا اضافی ہے ۔

علی ھذا لقیاس اس موضوع پر مختلف ماہرین لسانیات و محققین تعلیم نے کام کیا ہے اور ان سب کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کتابوں کے معیار قرأت کو متاثر کرنے میں مندرجہ ذیل عوامل کار فرما ہیں :

**۱ ۔ فرہنگ (Vocabulary Load)** معیار قرأت کو متاثر کرنے والے جملہ عناصر میں یہ عنصر سرفہرست آتا ہے ۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عبارت میں نئے یا غیر مانوس (Unfamiliar) الفاظ جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر عبارت کا پڑھنا مشکل ہو جائے گا اور اسی طرح جتنے مانوس الفاظ زیادہ ہوں گے عبارت سہل ہوگی ۔ پڑھے ہوئے الفاظ کے اعادہ و تکرار پر اسی لیے زور دیا جاتا ہے کہ اس سے معیار قرأت یا درجۂ اشکال کم ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح چھوٹے الفاظ جو دو حرفی یا سہ حرفی مرکبات ہوں ، بالعموم بڑے الفاظ یعنی پنج حرفی یا شش حرفی مرکبات سے آسان ہوتے ہیں ۔ عصر حاضر کے ایک مشہور امریکی محقق فلیش (Flesh) لکھتے ہیں کہ محض نامانوس الفاظ کا استعمال عبارت کی تفہیم پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز جو عبارت

کے اشکال اور اُلجھاؤ کا باعث ہوتی ہے وہ مجرد اور غیر مقرون (Abstract) الفاظ کا استعمال ہے ۔ مقرون (Concrete) الفاظ خواہ نئے اور مشکل ہی کیوں نہ ہوں معیار قرأت کو بہت زیادہ متاثر نہیں کرتے ۔

**۲ ۔ فقرے کی ساخت (Sentence Structure)** : دوسرا عنصر جو معیار قرأت پر اثر انداز ہوتا ہے وہ فقروں کی بناوٹ ہے ۔ فقرہ جس قدر لمبا ہوگا ، عبارت اسی قدر مشکل ہوگی ۔ ایسی عبارت جو سادہ اور مختصر جملوں پر مشتمل ہوگی اس عبارت سے یقیناً آسان سمجھی جائے گی جو مرکب اور پیچیدہ جملوں سے مل کر بنی ہوگی ۔

**۳ ۔ تخیل کی گہرائی (Idea Density)** : خیالات سادہ ہوں تو عبارت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہوتا ۔ لیکن جوں جوں خیالات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں عبارت کی تفہیم مشکل ہوتی چلی جاتی ہے ۔

**۴ ۔ دلچسپی (Interest)** : اگر موضوع قاری کے ذوق کے مطابق ہو ۔ اگر مصنف کا طرز بیان صاف اور واضح ہو ۔ اگر وہ قاری کو بلا واسطہ مخاطب کرکے سمجھانے کے قابل ہو ۔ اگر اس کی تحریر میں "اسمائے ضمیر" کثرت سے استعمال کیے گئے ہوں ۔ اگر مصنف کی اپنی ذات کا عکس اس کی تحریر میں نمایاں نظر آتا ہو ۔ اگر کہانی یا مضمون لکھنے والا قاری باتیں کرتا ہوا نظر آئے تو عبارت آپ سے آپ دلچسپ ہو جائے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمے اور عبارت کے وہ ٹکڑے جن میں متکلم کی بات کو بلاواسطہ (Direct Speech) بیان کر دیا گیا ہو ۔ قاری کے لیے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں بہ نسبت بیانیہ مضامین کے ۔ اس بارے میں امریکی خاتون Chall نے سچ کہا ہے :

"ماہرین قرأت اور اساتذہ اس بات کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ قاری اگر کسی موضوع اور مضمون کے ساتھ غایت درجے کی دلچسپی رکھتا ہو تو وہ عبارت کے اشکال اور فقروں کی پیچیدہ تراکیب کی حدود توڑ کر بھی عبارت کے مفہوم کو پا لیتا ہے" ۔

**۵ ۔ کتاب کی ماہیت ، بناوٹ اور ترتیب (Format)** : کسی کتاب کی ظاہری شکل و صورت ، اس کی طباعت و کتابت ، اس کی توضیحات و

تصاویر اور اس کے اسباق کی ترتیب سبھی عناصر یقیناً عبارت کی تفہیم میں سہولت پیدا کرتے ہیں اور کتاب کے معیار قرأت کو معتدل اور متوازن کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہال برٹ (Halbert) نے کئی کتابوں کے تجربے کے بعد یہ بات ثابت کی کہ مصور کہانی سے بچے سبق کی تفہیم میں مدد لیتے ہیں اور اس سے زیادہ تفصیلات اخذ کرتے ہیں۔ بہ نسبت ایک غیر مصور کہانی کی عبارت کے۔

۲۔ **مواد کی ترتیب (Organization)**: عبارت میں خیالات کی تنظیم اور جملوں کی ترتیب کا خیال رکھا جائے تو نہ صرف عبارت میں ایک حسن اور بانکپن پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ایسی عبارت سہل الفہم بھی ہو جاتی ہے۔ مواد کو عنوانات، ذیلی عنوانات اور پھر مزید چھوٹی چھوٹی سرخیوں میں تقسیم کرنے سے عبارت کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے اور اس کا معیار قرأت اعتدال پر آ جاتا ہے۔ درسی کتابوں کے مقابلے میں بعض خلاصوں اور گائیڈوں کی مقبولیت کا راز بھی اسی نکتے میں مضمر ہے کہ وہاں مواد کو اختصار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی سرخیوں کے تحت دیا جاتا ہے۔ عبارتوں کی غلط اور مشکل ترتیب کے باعث اور لمبے اور نظر کو تھکا دینے والے پیروں کی وجہ سے بعض اوقات آسان الفاظ پر مشتمل عبارات بھی گنجلک ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مشکل الفاظ کو نکال کر محض آسان الفاظ لگا دینے سے عبارت کے ''معیار قرأت'' میں کوئی فرق نہیں آتا جب تک کہ اس عبارت کے ڈھانچے اور اس کی پوری ترتیب کو نہ بدل دیا جائے۔ عبارت کی تسہیل کا راز عبارت کی مجموعی ہیئت اور اس کی ترتیب میں ہے نہ کہ محض انفرادی لفظوں اور جملوں میں۔

**معیار قرأت کو جانچنے کے طریقے:**

اس نظریے سے عبارت کو جانچنا اور کتابوں کو پرکھنا کہ وہ کس سطح اور کس استعداد کے قاری کے لیے موزوں ہوں گی خاصا کٹھن کام ہے اور اس مشکل کام کو دو طریقوں سے سرانجام دیا جاتا ہے:

۱۔ داخلی طریقہ (Subjective Method)

۲۔ خارجی طریقہ (Objective Method)

**داخلی طریقہ :** معیار قرأت کے بارے میں انسانی اندازے اور تخمینے جو محض پارکھ کی ذاتی رائے اور اس کی داخلی سوجھ بوجھ کے عکاس ہوں، داخلی طریقے کی صف میں شمار ہوتے ہیں ۔ اس طریقے کی رو سے کتاب کو پرکھنے والا کتاب کا مطالعہ کرتا ہے ۔ زبان و بیان کا جائزہ لیتا ہے ۔ موضوع اور مطالب پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے اور اس سارے عمل کے بعد وہ کتاب کے ''معیار قرأت'' کے بارے میں اپنی رائے دے دیتا ہے ۔ یہ اندازہ پارکھ کے ذاتی نظریات، اس کے مخصوص رجحانات اور مزاج سے بیشتر متاثر ہوتا ہے اور اس طریقے میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو انسانی مشاہدہ میں موجود ہو سکتی ہیں ۔ اس طریقے سے حاصل کیے گئے ''تخمینے'' کو بالعموم قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا ۔ اسی لیے ایک ہی کتاب پرکھنے کے لیے ایک سے زیادہ پارکھوں کے پاس بھیجی جاتی ہے اور یہاں بھی یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ناقدین کے مزاج، نظریات، خیالات اور مذاق میں اختلافات معیار قرأت کی پیش گوئی میں بھی اختلاف کا باعث بنتے ہیں اور اکثر ان کے اندازوں میں ہم آہنگی اور توازن نہیں ہوتا بلکہ ان کے تخمینوں میں خاصا تفاوت ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ ایک مضمون کو ایک صاحب چھٹی کے معیار کا ٹھہراتے ہیں اور دوسرے صاحب دسویں کا ۔ اس طریقے میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں اس قطعیت کا ہونا ممکن نہیں جو الجبرے کے کسی فارمولے میں پائی جاتی ہے ۔ بعض ماہرین لسانیات اس طریقے کو زیادہ مؤثر اور معیار قرأت کی پیش گوئیوں کو زیادہ قابل اعتماد بنانے کے لیے ماہرین کے علاوہ معیار قرأت کا اندازہ اسی سطح کے طالب علم سے کرواتے ہیں جس کے لیے وہ کتاب لکھی گئی ہو ۔ یعنی اگر وہ بچے اس کتاب کو پڑھ لیں اور اس کے اکثر و بیشتر حصص کے مفہوم کو سمجھ لیں تو کتاب کا معیار قرأت درست، ورنہ غلط ۔ اس طریقے سے پہلے طریقے کی خامیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔ اس لیے کہ یہ طریقہ بھی داخلی ہے اور اس میں بھی ہر بچے کی ذاتی پسند یا ناپسند کو دخل ہوتا ہے ۔ اس میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مضمون یا کتاب بچوں کے معیار قرأت سے پست ہو تو اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر کم

علمی اور کوتاہ مائیگی کے باعث بچے زبان کی حسن و خوبی یا بیان کی عمدگی و ناپختگی کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طریقے کے بارے میں Iverson اور Hunnicut کہتے ھیں :

Until very recently, individual opinion has been the only appraisal mechanism available. Authors made estimates, librarians made estimates, and readers made estimates. And of course all were different.

**خارجی طریقہ :** یہ وہ طریقہ ھے جس میں پارکھ کی داخلیت اور اس کے ذاتی رجحانات اور مزاج کو بالکل دخل نہیں ھوتا بلکہ عبارت اس کے لفظوں اور جملوں کے شماریاتی تجزیے (Statistical Analysis) کے ذریعے کسی ادب پارے کے معیار قرأت کا فیصلہ کر دیا جاتا ھے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ھے جس میں کسی کے تعصب یا ایقان کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ معیار قرأت کے فیصلے پر اثر انداز ھو سکے بلکہ یہ ایک ایسا پیمانہ ھے جو اعداد و شمار کے بل بوتے پر چلتا اور ضرب و تقسیم کے سہارے آگے بڑھتا ھے۔

ھماری زبان میں لکھی ھوئی کتابوں کا معیار قرأت معلوم کرنے کا ابھی تک کوئی ایسا کلیہ ایجاد نہیں کیا جا سکا جو انسانی اندازوں کی خامیوں کو دور کر سکے اور کتابوں کے معیار کے بارے میں زیادہ قطعی اور قابل اعتماد رائے دے سکے۔ لیکن انگریزی میں پچھلے تیس سالوں میں مسلسل تجربات اور پیہم تحقیق و جستجو کے بعد ماھرین نے ایسے کلیات (فارمولے) معلوم کیے ھیں جو بڑی کامیابی کے ساتھ کتابوں کے معیار قرأت کو پرکھتے اور ان کے درجہ اشکال کے بارے میں پیش گوئی کرتے ھیں۔ امریکہ میں ایسے بیس پچیس کلیات وضع ھو چکے ھیں اور ان میں پانچ سات خاصے معروف اور قابل اعتماد حد تک کامیاب ھیں۔

معیار قرأت معلوم کرنے کا کلیہ اسی مفروضے پر کام کرتا ھے کہ عبارت میں جتنے زیادہ نئے الفاظ آئیں گے عبارت اتنی ھی مشکل ھوگی اور فقرے کی اوسط لمبائی جس قدر زیادہ ھوگی عبارت اتنی ھی معیار قرأت

کے لحاظ سے اونچی ھو جائے گی۔ کلیے کے اطلاق کا طریقہ یہ ھوتا ھے کہ کسی کتاب کے چند ایک نمونے بلا تخصیص (Random Sampling) لے لیے جاتے ھیں۔ مثلاً کتاب کا ھر دسواں، بیسواں اور تیسواں صفحہ انتخاب کر لیا جاتا ھے اور ھر صفحے پر اندازاً سو حرفوں میں سے فقروں کی تعداد گن لی جاتی ھے اور تمام نمونوں میں سے فقروں کی تعداد گننے کے بعد فقرے کی اوسط لمبائی معلوم کر لی جاتی ھے۔ پھر ایسے الفاظ شمار کیے جاتے ھیں جو طلباء کے لیے نئے یا غیر مانوس ھوتے ھیں۔ کون سا لفظ مانوس ھے اور کونسا غیر مانوس۔ اس کا فیصلہ بالعموم آسان الفاظ کی ایک معیاری فہرست کی مدد سے کیا جاتا ھے۔ جو لفظ اس فہرست میں موجود ھوگا وہ مانوس اور جو لفظ اس فہرست سے باھر ھوگا وہ غیر مانوس۔ غیر مانوس الفاظ کی کل تعداد جو کتاب کے تمام نمونوں میں دستیاب ھوئی ھو جمع کر لی جاتی ھے اور پھر ایسے الفاظ کا تناسب فیصد معلوم کیا جاتا ھے۔ جب یہ دو چیزیں حاصل ھو جاتی ھیں تو پھر ایک فارمولے کی مدد سے کتاب کا معیار قرأت معلوم کر لیا جاتا ھے۔ انگریزی میں بعض کلیے ایسے بھی ھیں جن میں محض مانوس اور غیر مانوس الفاظ کا تناسب ھی نہیں دیکھتے بلکہ یہ بھی گنتے ھیں کہ اسمائے ضمیر کتنے ھیں اور حروف جار کتنے ھیں اور پھر ان دونوں کے غیر مانوس الفاظ کے تناسب فی صد اور فقرے کی اوسط لمبائی کے ساتھ ایک فارمولے کی شکل دے کر معیار قرأت معلوم کر لیتے ھیں۔

کلیات وضع کرنے سے پیشتر ماھرین لسانیات نے مختلف کتابوں اور جماعتوں پر تجربے کیے ھیں۔ کسی نے بچوں کی کتابوں پر کام کیا، کسی نے بالغوں کے لٹریچر پر چنانچہ جو کلیات بالغوں کی کتب پر مرتب کیے گئے ھیں، وہ بالغوں کے لٹریچر کا معیار قرأت معلوم کرنے میں زیادہ کامیاب ھیں۔ بہ نسبت بچوں کی کتابوں کے اور جو کلیات بچوں کی کتابوں پر مبنی ھیں وہ بالغوں کے ادب کا معیار قرأت معلوم کرنے میں نسبتاً کم کامیاب ھیں۔

**افادیت:** انگریزی میں رائج کلیات مختلف طریقوں اور آزمائشوں کے ذریعے اپنی صحت اور اعتماد (Validity and Reliability) کے لحاظ

سے آزمائے جا چکے ہیں اور اکثر و بیشتر مواقع پر یہ صحیح اور قابل اعتماد نتائج دیتے ہیں ۔ ان کی افادیت کا یہ عالم ہے کہ آج امریکہ کی تمام درسی اور اضافی کتابیں خواہ وہ زباندانی سے متعلق ہوں یا دیگر مضامین سے ، اشاعت سے قبل ایک سے زیادہ معیاری کلیات کی کسوٹی پر آزما لی جاتی ہیں کہ ان کا معیار قرأت طلباء کے استعداد قرأت سے کسی حالت میں بھی بلند یا پست نہ ہو۔ اس لیے کہ دونوں صورتوں میں طلباء کا نقصان ہوتا ہے ۔ مصنفین ، ناقدین ، ناشرین اور اساتذہ سبھی کو ان پر بھروسا اور اعتماد ہے ۔ صنعت کاروں نے انہی کلیات کی مدد سے اپنی مصنوعات کو عوام کی استعداد قرأت کے مطابق آسان زبان میں مشتہر کرنا شروع کر دیا ہے اور اس سے ان کی فروخت کی شرح بڑھ گئی ہے ۔ بڑے بڑے تاجروں اور کارخانہ داروں نے اپنے ملازمین کے ہدایت نامے اور روزمرہ کے استعمال کے فارم اور گشتی مراسلوں کو کلیات کی روشنی میں از سر نو مرتب کیا ہے تاکہ کم پڑھے لکھے ملازمین ان سے پورا فائدہ آٹھا سکیں ۔ امریکہ میں جس قدر سرکاری گزٹ اشتہارات اور اطلاع نامے چھپتے ہیں وہ اشاعت سے قبل کسی کلیے کی مدد سے اپنے معیار قرأت کے لیے پرکھے جاتے ہیں تا کہ عوام کے لیے ان کا سمجھنا مشکل نہ ہو۔ فلیش (Flesch) کا فارمولا تو امریکہ میں اس قدر مقبول ہوا کہ اخبار نویسوں ، ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں کے مدیروں اور فلم سازوں نے گاہے گاہے اپنے اداریوں اور دیگر تحریروں کو اسی فارمولے پر پرکھنا شروع کیا اور جب اپنے اخبارات اور جرائد کا معیار قرأت بلند پایا تو انہیں آسان کر دیا ۔ اس سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ ان کے اخبارات عوام الناس میں زیادہ مقبول ہو گئے اور اس طرح ان کی اشاعت بڑھ گئی۔

کلیات کا صرف یہی فائدہ نہیں کہ وہ ہمارے معیار قرأت کی پیشگوئی کرتے ہیں بلکہ یہ کلیات ایسی راہوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں ، جن پر گامزن ہو کر اپنے رسالوں ، اخباروں اور کتابوں کا معیار قرأت ضرورت کے مطابق بلند یا پست کر سکتے ہیں ۔

اختصار کے ساتھ کلیات کے مندرجہ ذیل فوائد گنوائے جا سکتے ھیں :

١ - ان کی مدد سے مصنفین کو اپنی کتابوں پر نظرثانی کرنے میں مدد ملتی ھے -

٢ - ان کی روشنی میں ھم اپنی تحریروں کو زیادہ دلچسپ ، مقرون اور آسان بنا لیتے ھیں -

٣ - بعض کلیات کتابوں کے معیار قرأت کی پیش گوئی اس قطعیت سے کرتے ھیں کہ ھمیں یہ پتہ چل جاتا ھے کہ فلاں کتاب فلاں درجے کے درمیانی یا آخری حصے میں زیادہ کامیابی سے پڑھائی جا سکتی ھے -

مندرجہ بالا فوائد سے قطع نظر ان کلیات کی کچھ خامیاں بھی ھیں - اور جب تک یہ خامیاں دور نہ ھو جائیں کلیات پر سو فیصد اعتماد کرنا درست نہ ھوگا - مثلاً

(الف) کلیات کتاب کے معیار قرأت کو جانچتے وقت اس کی ھیئت تصاویر ، گراف ، نقشے وغیرہ کو پیش نظر نہیں رکھتے -

( ب ) کلیات میں ابھی تک یہ صلاحیت پیدا نہیں ھو سکی کہ انسانی دلچسپی کے عنصر کو ٹھیک ٹھیک ناپ سکیں صرف Flesch کا کلیہ ایسا ھے جو انسانی دلچسپی (Human Interest) کو ماپنے کا دعوی کرتا ھے اور اس کے بارے میں ناقدین کا خیال ھے کہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں -

( ج ) کلیات عبارتوں کے ادبی عناصر ، تشبیہات و استعارات کو ٹھیک طرح سے نہیں ناپ سکتے -

( د ) کلیات تحریروں کی بندش اور مواد کی ترتیب کو پرکھنے سے قاصر رہے ھیں -

( ہ ) ھر کلیہ ھر قسم کے مواد کو پرکھنے کی اھلیت نہیں رکھتا مثلاً آرٹس کی کتابوں پر (Standardized) مبنی فارمولا سائنس کی کتابوں پر پوری طرح حاوی نہیں ھو سکتا -

اسی طرح بچوں کی کتابوں کے لیے کلیات اور ہوں گے اور بڑوں کے لیے اور۔ کلیات صرف اتنا بتاتے ہیں کہ یہ کتاب اپنے معیار قرأت کے اعتبار سے فلاں درجے کے طالب علم کے لیے قابل فہم ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس درجے پر پڑھنے والا ہر طالب علم اسے پڑھنا پسند کرے گا۔

لیکن جب ہم کلیات کی خوبیوں اور خامیوں کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کلیات کی افادیت اپنی جگہ پر مسلم ہے اور یہ کلیات یقیناً ''معیار قرأت'' کے بارے میں انسانی اندازوں کی خامیوں کو دور کر سکتے ہیں۔ البتہ داخلی اور خارجی دونوں طریقوں کے ستعمال سے معیار قرأت معلوم کرنے کا کام اور بھی زیادہ عمدہ اور صحیح ہو جاتا ہے۔

آخر میں میں اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ گذارش کروں گا کہ ہمیں بھی اس شعبے میں کچھ کام کرنا چاہیے اور درسی کتابوں کا معیار قرأت جانچنے کے لیے کوئی فارمولا تیار کرنا چاہیے۔ بلاشبہ ایسے کام انفرادی کوششوں سے زیادہ اجتماعی کوششوں کے محتاج ہوا کرتے ہیں اور ایسے کاموں کے لیے پیہم تحقیق اور مسلسل تجربات کی ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس تحقیق و تجسس میں جو محنت صرف ہوگی اور ہمیں جو ریاض کرنا ہوگا اس کا پھل یقیناً بہت میٹھا اور رسیلا ہوگا۔

---

# نظریۂ پاکستان
# اور ہماری درسی کتابیں*

## نصابی کتب میں نظریۂ پاکستان کو پیش کرنے کے بارے میں تجاویز

چار دن پہلے کی بات ہے میں چند دوستوں کے ساتھ ایک جگہ کھانے پر مدعو تھا۔ کھانے کے بعد صاحب خانہ نے ٹیلی ویژن سے تواضع کی۔ ادھر ٹیلی ویژن پر اشتہار نمائی ہو رہی تھی، ادھر احباب میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ بچوں کے دل و دماغ میں نظریۂ پاکستان، درسی کتابوں کے ذریعے کیونکر راسخ کیا جائے۔ دراصل اس بحث کا محرک میں ہی تھا۔ کیونکہ اس طرح توقع تھی کہ فاضل دوستوں سے کچھ ایسے نکات مل جائیں گے جنہیں اس مذاکرہ میں پیش کیا جا سکے۔ ابھی بحث زیادہ دور نہیں نکلی تھی کہ ٹیلی ویژن پر ایک نووارد فلم کا خاصا طویل اشتہار دعوت نظر دینے لگا — اس کے مناظر ہماری بچی کھچی روایات و اقدار کے اعتبار سے بھی کم از کم حیا سوز کہے جا سکتے ہیں۔ پاکستانی فلم اور ولایتی کلبوں کی بے باک رقاصی! — ایک دوست نے فرمایا — یہ لیجیے نظریۂ پاکستان کی وہ تعبیر، جو ابلاغ عامہ کے ادارے ہر گھر میں پہنچا رہے ہیں۔ حقیقی اور دلفریب! — دوسرے دوست نے تائید کی۔ جب تک ٹیلی ویژن فرنگی تہذیب اور لادینی نظریات کی ترجمانی کرتا رہے گا درسی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کے وعظ بے اثر ہونگے۔ میں نے پوچھا، کیوں؟ بولے، کتاب کی نسبت ٹیلی ویژن زیادہ مؤثر ذریعۂ ابلاغ ہے۔ کتاب تو محض نظریات ذہن تک پہنچاتی ہے لیکن ٹیلی ویژن ایک ایسی پُر تاثیر سمعی و بصری اعانت ہے جو خیالات و نظریات کو دل و دماغ میں آثار

---

* یہ مقالہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے مذاکرے ''نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب'' منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں پڑھا گیا۔

سکتی ہے - کتاب سے اثر پذیری کے لیے خاص حد تک ذہنی پختگی اور چند مہارتوں کی ضرورت ہے لیکن ٹیلی ویژن سے ''اکتساب فیض'' تو تین سالہ بچہ بھی کر سکتا ہے اور مطلق ان پڑھ شخص بھی - اس کا دائرہ وسیع ، اس کا عمل وقیع !! بات درست تھی اور مدلل ــــ مانے بغیر چارہ نہ تھا ، لیکن ایک اور دوست نے سہارا دیا کہ اس گفتگو سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ اساتذہ اپنی تدریس میں اور مؤلفین اپنی کتابوں میں ان نظریات کا پرچار نہ کریں جو ہمارے لیے ایمان کا درجہ رکھتے ہیں - جن پر ہمارے وطن عزیز کی بنیادیں استوار ہیں - بلکہ اس سے تو اس خیال کو اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ ان حالات میں جب تبلیغ و اشاعت کے مؤثر آلات و ذرائع منفی اقدار و رجحانات کی ترویج میں مصروف ہیں تو ہم عمل تدریس اور درسی کتب میں ان کی تکفیر و تکذیب کا زیادہ اہتمام کریں اور مثبت انداز میں ان محرکات و اساسیات کی وضاحت کریں جو پاکستان کے قیام کا سبب ہیں - لہذا یہ لازم ہے کہ درسی کتابیں ہماری قومی اور دینی اقدار و روایات کی ترجمانی کریں - درسی کتاب کا کام محض چند معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ اسے بچوں کے ذہنوں کی تعمیر اور سیرت و کردار کی تشکیل میں ایک مؤثر آلہ کار ثابت ہونا چاہیے ــــ تعلیم کا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ وہ بچے کو اپنے معاشرے میں کامیاب اور مفید زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرے اور تعلیمی عمل میں درسی کتاب نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے ــــ کتاب انسانی اخلاق کو سنوارتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے لہذا ہم یقیناً ایسی درسی کتابوں کی حمایت کریں گے جو ہماری ملت کی اخلاقی و روحانی اقدار کے احیاء میں معاون ہوں -

اس پر ایک دوست نے اعتراض کیا کہ درسی کتابوں کو مخصوص نظریات کی اشاعت کے لیے استعمال کرنا درست نہیں - درسی کتاب کو صرف علم کی ترسیل کا فرض پورا کرنا چاہیے - اسے عقائد و نظریات کا مبلغ نہیں بننا چاہیے ــــ بظاہر یہ بات بھی دل کو لگتی ہے لیکن احباب نے متفقہ طور پر اس سے اختلاف کیا - ان کا ارشاد تھا کہ اول تو تعلیم کا مقصد محض معلومات بہم پہنچانا ہے ہی نہیں ، تعلیم کا اولین

مقصد تو شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ دوسرے تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس کا کام نظریاتی اقدار کو محفوظ رکھنا اور نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل کرتے رہنا ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب درسی کتابیں اسی نقطۂ نظر سے لکھی جائیں۔ مزید برآں دنیا میں جتنے بھی معاشرتی نظام موجود ہیں ان کی حامل ریاستیں اپنے نصاب اور درسی کتب میں اپنے مخصوص نظام کی اساسیات کو کھلے دل سے پیش کرتی ہیں۔ بحث میں روس اور چین کا ذکر آیا جہاں ایک مخصوص رجحان اور نظریہ پوری تعلیم پر حاوی رہتا ہے۔ امریکی درسی کتابوں کا حوالہ دیا گیا جو جمہوریت کے عمل اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بچوں کو تیار کرتی ہیں۔ انگلستان کی درسی کتب جمہوریت و شاہ پرستی کی آئینہ دار ہیں۔ ایران کی کتابیں شاہ پسندی کے رجحانات کو نمایاں کرتی ہیں — جب باقی ممالک کا یہ عالم ہے تو پاکستان تو خالصتاً نظریاتی مملکت ہے بلکہ ایسی مملکت جس کا اساسی نظریۂ حیات پہلے وجود میں آیا اور اس کے جغرافیائی خد و خال بعد میں ابھرے — ایسی مملکت کے لیے تو اور بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے نظریات و عقائد کو تعلیمی عمل میں مرکزی حیثیت دے۔

جب ہم نظریہ پاکستان کی بات کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ذہنوں میں ابھی تک کچھ ابہام سا موجود ہے یا کم از کم نظریۂ پاکستان کے خد و خال اور نقوش زیادہ واضح اور روشن نہیں۔ یہ بات واقعی حیرت افزا ہے۔ آخر یہ ابہام کیوں؟ — جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان اسلامی طرز فکر اور اسلامی ضابطۂ حیات سے عبارت ہے تو ہم واضح طور پر اس کا اعلان کرتے ہوئے شرماتے کیوں ہیں؟ ہم ایسے اقدامات سے کیوں گریز کرتے ہیں، جن سے وہ طرز زندگی اپنانے میں مدد ملے جو اسلام کو مطلوب ہے؟ قائد اعظم کے اس واضح اعلان کے باوجود کہ پاکستان کا قیام فی الحقیقت اس وقت عمل میں آ گیا تھا جب برصغیر میں پہلا شخص مسلمان ہوا تھا۔ نظریۂ پاکستان کو اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی عوامل

میں کیوں اُلجھا دیتے ہیں؟ اس حقیقت سے تو ہمارا کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ محض اس لیے کیا تھا کہ ہم مسلمان تھے، مسلمان رہنا چاہتے تھے اور ہم ایسا خطۂ زمین چاہتے تھے جہاں اسلام ایک زندہ اور متحرک معاشرے کی حیثیت سے موجود ہو۔ کیا یہ درست نہیں کہ قیام پاکستان کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ قرار پائی تھی؟ کیا یہ درست نہیں کہ ہر وہ فکری، عملی اور اخلاقی اسلوب حیات جو ہمیں اسلام نے عطا کیا اور جو ہمیں بحیثیت مسلمان دوسری قوموں سے ممتاز کرتا ہے، نظریۂ پاکستان کا جزو لاینفک ہے——اگر یہ سب کچھ درست ہے——اور یقیناً درست ہے——تو ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنی نئی پود کو نظریۂ پاکستان یا بالفاظ دیگر اسلامی ضابطۂ حیات سے روشناس کرانے کے لیے اپنے نصاب اور اپنی درسی کتابوں میں مناسب تبدیلیاں کریں اور اپنے تدریسی مواد کو اس طرح پیش کریں کہ ہمارے بچوں کی سیرت میں وہ تمام نقوش ابھر آئیں جو ایک سچے مسلمان اور قابل فخر پاکستانی کا طرہ امتیاز ہونے چاہئیں۔

سامعین کرام!

پچھلے دو دن میں آپ کو اعلیٰ پائے کے علمی مقالات سننے کا موقع ملا اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نظریۂ پاکستان کے ترکیبی عناصر سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔ میں نہایت اختصار سے نظریۂ پاکستان کی ان اساسیات کا تکرار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ اس طرح یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی کہ ہم اپنی درسی کتابوں میں کون سے موضوعات اور پیش کش کا کیا طریقہ اختیار کریں کہ ہمارے بچے نہ صرف نظریۂ پاکستان کو سمجھ لیں بلکہ اسے اپنا بھی سکیں۔

نظریۂ پاکستان میں جس خیال کو خشت اول کی حیثیت حاصل ہے وہ اسلامی قومیت کا تصور ہے یعنی اسلام کے نام لیوا دنیا کی دوسری تمام قوموں سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ ان کی اپنی قومیت ہے اور الگ تہذیب اور الگ تمدن ہے۔ اس قومیت کی بنا نہ اتحاد وطن ہے نہ رنگ و نسل اور زبان کا اشتراک۔ مسلمانوں کو جو چیز متحد قوم

بناتی ہے وہ ان کا دین ہے ، خدائے لا شریک اور نبی آخر الزماںؐ پر ان کا ایمان ۔

نظریۂ پاکستان کی دوسری اساس یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظام حیات صرف اسلام کے تابع ہے ۔ ان کی معیشت ہو کہ معاشرت ، تہذیب ہو کہ ثقافت ، حکومت ہو کہ سیاست وہ اسلام ہی سے ہدایت پاتی ہے ۔ چنانچہ پاکستانیوں کے لیے جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ نہ خٹک ناچ ہے نہ بھنگڑا ، لڈی ہے نہ کلاسیکی رقص ، پاکستانی تہذیب کے سوتے گندھارا آرٹ اور بدھ کے مجسموں سے نہیں پھوٹتے بلکہ اس کی ثقافت کے دھارے یثرب و بطحا کی سر زمین سے نکلتے ہیں اور پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں ۔

پاکستانیوں کے لیے جو چیز سرمایۂ افتخار بن سکتی ہے وہ موہن جو داڑو یا ہڑپہ کے دھندلے نقوش نہیں بلکہ وہ اسوۂ حسنہ ہے جو آفتاب نصف النہار کی طرح درخشندہ و تابندہ ہے ۔

نظریۂ پاکستان کا تیسرا بنیادی پتھر جمہوریت ہے ۔ اسلام کا مزاج جمہوری اور شورائی ہے ، اس میں آمریت اور استبداد کی کوئی گنجائش نہیں لہذا پاکستان میں ہمیں اسلامی تعلیمات کے مطابق جمہوری اقدار کو فروغ دینا ہے ۔

نظریۂ پاکستان کا چوتھا بنیادی اصول اسلامی حکومت کا قیام ہے ۔ اس کا مطلب پورے نظام زندگی کو اسلام کے مطابق رواں دواں کرنا ہے ۔ لہذا ہمیں کھلے دل سے پورے اسلامی نظام کو یعنی انفرادی زندگی سے لیکر ملکی قوانین اور سیاسی ضابطوں تک اسلام کے مطابق رائج کرنا ہے اور اس مبہم کیفیت کو ختم کرنا ہے جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام نہیں بلکہ اسلام کی دی ہوئی چند اقدار مثلاً حب الوطنی ، دیانت ، اتحاد وغیرہ کو اختیار کر لیا جائے ۔ اس طرح کی پہلو دار تاویلات ختم ہونی چاہئیں ۔

احترام آدمیت نظریۂ پاکستان کی پانچویں اینٹ کہی جا سکتی ہے ۔ اسلام نے انسان کو قابل تکریم بنایا ہے ۔ ولقد کرمنا بنی آدم ۔

یہ تکریم عام ہے۔ ہر انسان خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، اس کا رنگ کچھ ہی ہو، اس کا عقیدہ کیسا ہی ہو، معاشی اعتبار سے متمول ہو یا مفلس، وہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے قابل احترام ہے۔ البتہ اللہ کے نزدیک قابل عزت وہی ہے جو متقی ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔

نظریۂ پاکستان کا چھٹا بنیادی اصول بقائے باھمی ہے۔ پاکستان ایک امن پسند ملک ہے۔ وہ خود امن سے رہنا چاھتا ہے اور دوسروں کو امن و سکون کی زندگی بسر کرتے دیکھنا چاھتا ہے۔ پاکستان کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ مسلمان پر امن زندگی گزارنا چاھتے تھے۔ قائد اعظم اور علامہ اقبال کے خطبوں میں یہ بات بارھا واضح کی گئی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پڑوسی ممالک میں زیادہ پر امن تعلقات استوار ہوں گے۔ پاکستان آج تک اس اصول پر کاربند ہے۔ کاش کہ ہمارا ہمسایہ بھی اس اصول پر عمل کرتا! پاکستان بین الاقوامی روابط میں بھی امن عالم کے فروغ کا خواھاں ہے۔

عدل و انصاف کا قیام نظریۂ پاکستان کا ایک اھم جز ہے۔ ھم بحیثیت مسلمان یہ چاھتے ھیں کہ پوری دنیا میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو۔ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھائیں اور کمزور ممالک کو یہ یقین ہو کہ طاقت ور دشمن کے مقابلے میں امن پسند ممالک اس کے حامی ہوں گے۔

نظریۂ پاکستان کی ایک اور اھم بنیاد عہد و پیمان کی پابندی ہے۔ یہ عہد و پیمان افراد کے درمیان ہو یا اقوام کے مابین، اس کا تقدس اس کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن نے ''اوفوا بالعقود'' کہہ کر اسے ایک فرض قرار دے دیا ہے۔

یہ ھیں وہ چند بنیادی اصول جن سے نظریۂ پاکستان کو واضح شکل دی جا سکتی ہے۔ نظریۂ پاکستان کی سلامتی اور اس کا تحفظ اس بات میں مضمر ہے کہ ھم ان اصولوں کی حفاظت کریں، ان کی بقا کی ضمانت دیں، ان کی ترویج و اشاعت کی کوشش کریں اور ان کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا حصہ تعلیم و تدریس کا ہے۔

سامعین گرامی قدر!

اب تک کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ نظریۂ پاکستان کوئی مبہم شے نہیں جسے سمجھا اور سمجھایا نہ جا سکے۔ یہ کوئی ایسا مجرد اور نازک خیال نہیں جو الفاظ کے جامے میں سما نہ سکے۔ یہ ایک ٹھوس متحرک اور جان دار تحریک سے عبارت ہے جس کے مظاہر، واضح اور عناصر ترکیبی، مشہود ہیں۔ ان کو سمجھنے، سمجھانے کے لیے کسی حکمت لقمانی یا مکالمات افلاطونی کا مرہون منت ہونا ضروری نہیں۔ یہ بات بھی طے ہو چکی ہے کہ درسی کتابوں میں قومی نظریات کی تعلیم و ترغیب کوئی عیب ہے نہ جرم، بلکہ یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر قوم اور ہر نظریاتی مملکت نے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ سپارٹا اور قدیم یونانی تہذیب سے لیکر عصر حاضر تک عمل تعلیم کے ذریعے سب قوموں نے اپنے مخصوص نظریے کو عام کیا اور آئندہ نسلوں کو یہ ورثہ منتقل کیا ہے۔

لہذا اب جو مسئلہ ہمارے زیر غور ہے وہ یہ کہ ہم ان نظریات کو درسی کتابوں میں کس طرح سے سموئیں کہ اس میں مختلف درجات تعلیم کا لحاظ بھی ہو، نفس مضمون اور نصاب کے تقاضے بھی پورے ہوں۔ کتاب میں دلچسپی اور سلاست کی خوبیاں بھی موجود ہوں اور بچوں میں اسلامی اخلاق اور روحانی اقدار بھی پرورش پائیں۔

سب سے پہلے مسلم قومیت کے تصور ہی کو لیجیے ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال اس کے زبردست حامی تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس خیال کو انہوں نے فلسفیانہ بنیادیں عطا کیں اور برصغیر کے مسلمانوں نے یہ سبق انہی سے سیکھا۔ لیکن یہ ایک عجیب سانحہ ہے کہ ایم۔اے کی سطح سے نیچے کسی درجہ پر اقبال کو اس حیثیت سے پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً آٹھویں جماعت تک کی اردو کی کتابوں میں اقبال کا کہیں کہیں ذکر موجود ہے لیکن وہ یا تو ان کے مختصر حالات زندگی تک محدود ہے یا پھر ان کی ایک آدھ نظم جو انہوں نے ابتدائی دور میں بچوں کے لیے لکھی تھی شامل نصاب ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اقبال کے اصل خیالات ہمارے بچوں تک نہیں پہنچ

رہے اور وہ اقبال کے ان عظیم نظریات سے ناواقف ہیں جن کی وجہ سے اقبال قومی اور اسلامی شاعر کہلاتے ہیں ۔ کیا یہ علامہ کے ساتھ نا انصافی نہیں کہ ان کا وہ پیغام جو قیام پاکستان کا باعث بنا اور ان کا وہ فلسفہ جو نظریۂ پاکستان کی اساس ہے ، وہ پاکستان کی نژاد نو تک نہیں پہنچ رہا ۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پوری اسلامی دنیا ان کے عظیم افکار و خیالات سے مستفید ہوتی لیکن حیف صد حیف کہ ہماری درسی کتابوں میں اقبال کو کچھ اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے گویا وہ محض پنجاب کا ایک شاعر ہے ۔ اگر کسی ایک آدھ کتاب میں اقبال کو شامل کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی دوسرے صوبوں کے شاعروں کو اس لیے بالمقابل بٹھایا جاتا ہے کہ اقبال کے فکر جمیل سے دوسری زبانوں کے لوگ خفا نہ ہو جائیں ۔ حالانکہ اقبال عالمی اور آفاقی مفکر ہیں ۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ کلام اقبال کے وہ حصے الگ جمع کیے جائیں جن میں عالمگیر اسلامی اخوت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان خیالات کو نثر میں بیان کیا جائے اور بالخصوص انگریزی ، اردو ، معاشرتی علوم اور اسلامیات کی کتابوں میں شامل کیا جائے ۔ اسی طرح سید جمال الدین افغانی وہ عظیم مفکر ہیں جنھوں نے بین الاسلامی اتحاد کا تصور پھیلایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک تحریک بھی چلائی ۔ ہماری درسی کتابوں میں جمال الدین افغانی کا نام بہت کم آتا ہے البتہ معاشرتی علوم کی کتب میں چند سطری تذکرہ مل جاتا ہے ۔

عالمگیر اخوت اور برادری کا صحیح تصور دینے کے لیے اردو ، انگریزی ، معاشرتی علوم اور اسلامیات کی کتابوں میں ایسے مضامین شامل کیے جا سکتے ہیں جن میں اسلامی ممالک کے باہمی اتحاد کی اہمیت و افادیت کو نمایاں کیا گیا ہو ۔ اسلامی رشتۂ اخوت کے علاوہ ان مادی ، معاشرتی اور سیاسی فوائد کا بھی ذکر کیا جائے جو اس اتحاد سے حاصل ہو سکتے ہوں ۔ مثلاً اسلامی دنیا کے مادی وسائل اتنے اہم اور کثیر ہیں کہ اگر یہ خود انہیں استعمال کریں اور باہم لین دین اور تجارت کریں تو نہ صرف اسلامی ممالک کی معیشت

مستحکم ہو جائے گی بلکہ اس سیاسی استحصال کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جس کا اصل سبب اسلامی ممالک کی نااتفاقی ہے -

متحدہ اسلامی قومیت کے نظریے کو فروغ دینے کے لیے اسلامی تہذیب و تمدن کے سرچشموں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرف رجوع لازم ہے لیکن ہماری کتابیں ان کے شایان شان ذکر سے خالی ہیں حالانکہ یہ وہ مقامات ہیں جو پوری اسلامی دنیا کی عقیدت کا محور ہیں -

درسی کتابوں میں اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے شامل ہونا چاہیے - اسلامی قوانین اور اسلامی شعائر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ اسلام محض چند عقائد و عبادات کا مجموعہ نظر نہ آئے بلکہ پوری زندگی کے ساتھ اس کا بھرپور رابطہ نمایاں ہو اور یہ محسوس ہونے لگے کہ اسلامی نظام حیات کو اختیار کرنے سے کوئی فرد کس طرح ایک مثالی انسان بن جاتا ہے - ہم طلباء کو ایسی کہانیاں اور واقعات سنائیں جن سے یہ پتہ چلے کہ عربوں کی اسلام سے پہلے کیا حالت تھی اور قبول اسلام کے بعد ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب آ گیا - مسدس حالی کے وہ حصے جہاں انہوں نے عربوں کی قبل از اسلام اور بعد از اسلام کیفیات کی تصویر پیش کی ہے ، درسی کتابوں میں ضرور شامل ہونے چاہئیں - اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ، صحابہ اور آئمہ کرام کی زندگیوں سے ایسے واقعات شامل نصاب ہونے چاہئیں جن میں اسلامی تمدن و معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہو - مثلاً تجارت کے اصول ، دشمنوں سے سلوک ، ہمسایوں سے روا داری ، محنت اور مزدوری کی عادت ، معاہدات کی پابندی ، تمام دنیاوی امور میں دینی احکام کا لحاظ وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم مکمل اور جامع ہے - وہ دنیا کو بھی حسین بناتی ہے اور آخرت کو بھی کامیاب کرتی ہے -

ہمیں درسی کتابوں میں اسلامی حکومت کے خد و خال واضح طریق سے پیش کرنے چاہئیں اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے ذہنی آمادگی کی فضا پیدا کرنی چاہیے - کتابوں میں ایسا مواد تدریس پیش کیا جائے کہ بچے اسلامی حکومت کی برکات سے واقف بھی ہو

جائیں اور متفق بھی۔ کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ یہاں ابھی تک کچھ لوگ اسلامی حکومت کا کچھ ایسا بھیانک نقشہ پیش کرتے ہیں کہ نظریاتی طور پر اس سے اتفاق رکھنے والے لوگ بھی دل سے نہیں چاہتے کہ عملاً اسلامی حکومت قائم ہو۔ ہمیں نئی نسل کے سامنے اسلامی حکومت کی ایسی صحیح اور واضح تصویر پیش کرنی چاہیے کہ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات راہ نہ پا سکیں۔ اسلامی تاریخ سے ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ ہر فرد بشر کو جان، مال اور آبرو کا تحفظ، فکر و نظر کی آزادی، عدل و انصاف اور ترقی کے بے شمار مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ اسلام ایسے معاشرے کو جنم دیتا ہے جہاں چوری، ڈاکہ، قمار بازی، رشوت، ناجائز دباؤ، بے جا سفارش، خویش پروری اور اس طرح کی دوسری معاشرتی برائیاں پیدا ھی نہیں ہو سکتیں۔ اسلامی معاشرہ ان تمام امتیازات کی نفی کرتا ہے جو انسان کو دولت یا حسب و نسب کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔

اگر ہماری کتابوں میں صدارتی طرز حکومت، پارلیمانی نظام اور بنیادی جمہوریت کے فوائد بیان کیے جا سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہماری معاشرتی علوم اور اسلامیات کی کتابیں اسلامی طرز حکومت کے فیوض و برکات سے خالی ہیں۔ کیا ہم ''اسلامی حکومت کی برکات'' اس طرح بھی بیان نہیں کر سکتے جس طرح کبھی ہم ''انگریزی راج کی برکتوں'' کو بیان کیا کرتے تھے؟

اسلام جمہوری اقدار کو رائج کرتا ہے لہذا درسی کتابوں میں جمہوری قدروں کا اس طرح ذکر کیا جائے کہ طلباء جمہوریت کی اہمیت، اس کے فوائد اور تقاضوں سے کماحقہ آگاہ ہو جائیں۔ مقام افسوس ہے کہ ابھی ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ تک بھی جمہوریت کی صحیح روح سے روشناس نہیں ہوا۔ تابدیگراں چہ رسد—ہماری اکثریت آج بھی اپنے حقوق سے اور ذاتی مفادات سے واقف ہے لیکن ایک اسلامی اور جمہوری ملک کے شہری کی حیثیت سے جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا شعور الا ماشاء اللہ صفر کے برابر ہے۔

امریکی معاشرے میں جمہوریت مذہب کا درجہ رکھتی ہے اور وھاں کی درسی کتابوں میں جمہوری طرز زندگی کی خوب اشاعت کی جاتی ہے۔ مدرسے کی تمام سرگرمیاں جمہوری طریق سے انجام پاتی ھیں۔ طلباء کی انجمنوں کے قیام اور مدرسے کے انتظام و انصرام میں طلباء کے اشتراک کے ذریعے بچوں کو جمہوری طرز عمل سے روشناس کیا جاتا ہے۔ ہم بھی اپنی درسی کتابوں میں ایسے مضامین اور کہانیاں اور سکول کے پروگرام میں ایسی سرگرمیاں شامل کر سکتے ھیں جن سے جمہوری شعور میں پختگی پیدا ھو۔ مختلف معاملات میں مشورے کی اھمیت، دوسروں کی رائے کا احترام، دوسروں کی خواھشات اور ضرورت کا لحاظ، معاشرتی فرائض کی ادائیگی، صرف شہریت کی کتاب کے موضوعات نہیں بلکہ انہیں اردو، انگریزی، معاشرتی علوم کی درسی کتابوں میں بطریق احسن سمویا جا سکتا ہے۔ بہتر ھوگا کہ یہ اقدار مکالموں، ڈراموں، واقعات اور کہانیوں کی صورت میں پیش کیے جائیں مثلاً اردو کی کتابوں میں ''وقت کا خیال''، ''ھمسائے کے نام خط''، ''باجہ مل گیا'' قسم کے مضامین اس طرز کی عمدہ مثالیں ھیں۔

اسلامی جمہوریت کی عمدہ مثالیں اسلامی تاریخ کے ہر دور سے مل سکتی ھیں۔ خلفائے راشدین کا زمانہ تو مثالی ہے ھی، اسلامی ھند کے مسلمان بادشاھوں کے بے شمار واقعات ایسے ھیں جن سے ان کے جمہوری طرز عمل کی وضاحت ھوتی ہے۔ بادشاھوں کا یہ جمہوری مزاج ھی تو تھا کہ ایک ادنیٰ غلام ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن سکتا تھا۔

اسی سلسلے میں اسلامی رواداری، اقلیتوں سے حسن سلوک اور دوسری اقوام سے فراخدلانہ تعلقات کی مثالیں بھی کچھ کم نہیں ھیں۔ عباسی خلفاء کے ھاں غیر مسلم علماء کا احترام، اورنگ زیب عالمگیر کی فوجوں میں ھندو جرنیلوں کا تقرر، اسلامی رواداری کے ثبوت نہیں تو کیا ھیں؟

**احترام آدمیت:**

یوں تو اسلامی نظام کا نام ھی تمام برکات کا ضامن ہے۔ لیکن

احترام آدمیت کی اہمیت کے پیش نظر اس کا الگ تذکرہ بھی لازم ہے۔ اقبال نے تو اسی عمل کو تہذیب و انسانیت کا مترادف قرار دیا ہے۔

با خبر شو از مقام آدمی　　آدمیت احترام آدمی
برتر از گردون مقام آدم ست　　اصل تہذیب احترام آدم ست

حضور علیہ الصلواۃ والسلام کا خطبہ حجۃ الوداع بالخصوص ایک جامع منشور کی حیثیت رکھتا ہے جس میں احترام آدمیت کو نکھار کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسا منشور ہے جس کا ہماری کتابوں میں بار بار ذکر آنا چاہیے اور ہمارے طلباء کے ذہنوں پر اس کے گہرے نقوش ثبت ہونے چاہئیں۔

اسلامی قوانین جنگ کے مطالعے سے یہ علم ہوتا ہے کہ اسلام میں انسانی جان و آبرو کو کس قدر محترم قرار دیا گیا ہے۔ عین حالت جنگ میں بھی بچوں، عورتوں، ضعیفوں، صلح کے خواہاں اشخاص کے ساتھ روا داری اور حسن سلوک کا درس دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ بدترین دشمن کی لاش کی بے حرمتی بھی منع کر دی گئی ہے۔

جہاں کتابوں میں احترام آدمیت کے تدریسی مواد کا شامل کرنا ضروری ہے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ استاد کا اپنا طرز عمل، انداز گفتگو اور طلباء سے روابط بھی اس احترام کے مطابق ہو۔ گالی دینا، طعنہ زنی کرنا، جسمانی سزا دینا بالخصوص کان پکڑوانا، ٹھڈے مارنا، دھکے مار کر کمرے سے باہر نکالنا، ذلت آمیز ناموں سے پکارنا—— احترام آدمیت کی نقیض ہیں۔ مدرسے کی نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں میں اس امر کا خاص اہتمام کیا جائے کہ طلباء کی انفرادیت جلا پائے اور ان کا احترام مجروح نہ ہو۔

**بقائے باہمی:**

اسلام افراد و اقوام کو باہمی پر امن زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ طلباء کے کردار میں اس جذبے کو شامل کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے تاریخی کہانیوں کے علاوہ فرضی حکایات بھی شامل نصاب کی جا سکتی ہیں جن میں بقائے باہمی کے اصولوں کو اجاگر کیا گیا ہو

اور آپس میں امن و امان سے رہنے کے فوائد واضح کیے گئے ہوں ۔ مدینہ منورہ میں حضورؐ نے یہودیوں سے جو معاہدات کیے اور پھر ان کو جس حسن و خوبی سے نبھایا، منافقین تک کے ساتھ جس طرح سے رواداری کا رویہ اختیار فرمایا وہ ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ کتابوں میں ایسی کہانیاں، ڈرامے اور مکالمے شامل ہوں جن سے بچوں کے دلوں میں دوسروں کے حقوق اور آزادی کے احترام کا احساس ابھرے — لیکن بقائے باہمی کا مطلب کمزوری یا بزدلی نہیں ۔ ظالم کو چھٹی دیے رکھنا یا مظالم سہنا اس اصول کا تقاضا نہیں۔ اسلام اس سلسلے میں اشداء علی الکفار و رحماء بینھم کا جامع اصول پیش کرتا ہے ۔ لہٰذا بچوں میں باطل کے خلاف ڈٹ جانے اور حق کی خاطر جہاد کرنے کا جذبہ بھی بیدار کرنا چاہیے ۔ اس ضمن میں سعدی و رومی کی بہت سی کہانیاں مفید مطلب ثابت ہو سکتی ہیں ۔

درسی کتابوں میں جس چیز کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ہمارے قومی مشاہیر و زعما کا تذکرہ یا تو سرے سے نہیں یا نہایت مختصر اور غیر مؤثر انداز میں ہے جس سے نہ تو ان مشاہیر کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور نہ اس سے وہ تاثیر پیدا ہوتی ہے جو طلباء کے کردار میں تبدیلی کا ذریعہ بن سکے ۔ قائد اعظم پاکستان کے سب سے بڑے ہیرو اور ہماری تاریخ کے قابل صد احترام رہنما ہیں ۔ آپ ہی نے ہمیں دو قومی نظریہ سے روشناس کرایا اور انہی کی مسلسل اور پرخلوص جد و جہد نے کاروان ملت کو پاکستان کی منزل پر پہنچایا ۔ قائد اعظم کی زندگی بے شمار قابل ذکر اور لائق تقلید واقعات سے پر ہے ۔ لیکن درسی کتابوں میں قائد اعظم کی شخصیت اور زندگی کو بھی ایک عام واقعاتی رنگ میں بیان کیا گیا ہے ۔ جس سے بچوں کی شخصیت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ۔

نظریۂ پاکستان کے اظہار کا تقاضا یہ ہے کہ قائد اعظم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حسین انداز میں طلباء کے سامنے پیش کیا جائے ۔ ان کے اقوال اور خطبات کے اقتباس جا بجا پیش کیے جائیں اور کسی مضمون کی کتاب بھی اس سے خالی نہیں ہونی چاہیے ۔ اسی طرح علامہ

اقبال کو مصور پاکستان کا نام تو دیا گیا ہے لیکن جو تصور اور تصویر انہوں نے بنائی تھی اس کے متعلق سرے سے کوئی مواد کتابوں میں نہیں۔

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے کلام میں اسلامی قومیت کے تحفظ اور فرنگی تہذیب سے احتراز کا بے شمار مواد موجود ہے لیکن ہماری کتابیں اس سے خالی ہیں۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد فرنگی تہذیب سے سمجھوتا کر لیا ہے؟ کیا اکبر الہ آبادی نے صرف چند اخلاقی رباعیاں ہی لکھی ہیں؟ کیا ان کو لسان العصر بنانے والی نظمیں یہی ہیں جو درسی کتابوں میں شامل ہیں۔ مثلاً ''بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے''۔ اکبر کی کلیات میں اور بھی بہت کچھ موجود ہے جو سیرت سازی اور ملی اقدار کے تحفظ کے لیے رہنمائی کا کام دے سکتا ہے۔

اقبال نے مغربی تہذیب سے ملت کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت کچھ کہا ہے۔ کیا آج ہمیں اس تہذیب سے کوئی خطرہ درپیش نہیں؟ یا اب ہم خدا نخواستہ اقبال کے اس کلام ہی کو فرسودہ سمجھنے لگے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر درجے کے طلباء اقبال کا کلام نہیں سمجھ سکتے لیکن اقبال کے پیغام کو بچوں کے لیے بچوں کی زبان میں پیش کرنا ناممکن نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم اقبال، اکبر، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر اور حفیظ کو درسی کتابوں کے انتخابات میں اتنی جگہ نہیں دیتے جتنی دوسرے کلاسیکی شعراء کو مثلاً میر حسن اور نسیم لکھنوی کی مثنویوں کو۔ اس سے بھی افسوسناک بات یہ ہے کہ نظریۂ پاکستان میں ایمان رکھنے کے باوجود ہمارے اکثر ذرائع ابلاغ بالخصوص ٹیلی ویژن اور فلموں نے مغربی تہذیب کی ترویج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لارڈ میکالے مر گیا لیکن اس کا فلسفہ ابھی زندہ ہے۔ اس نے اپنے نظام تعلیم سے

Indians in blood and colour but English in tastes, opinions, in morals and in intellect.

پیدا کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ ہم نے بھی اپنے موجودہ نظام تعلیم

میں اور بالخصوص ابلاغ عامہ کے ذرائع سے اکثر پاکستانیوں کو ان کی رنگت کے سوا پورا انگریز بنا دیا ہے۔ چنانچہ آج ہم مغرب ہی سے تخلیقی تحریک (Inspiration) حاصل کرتے ہیں۔ رسم و رواج، فیشن حتیٰ کہ نظریات تک مغرب سے ملتے ہیں۔ انگریزی درسی کتابوں میں علی، نسیمہ اور جمیل الفنسٹن سٹریٹ کی سیر کرتے ہیں۔ لندن کی سیاحت کرتے ہیں۔ سینما گھروں کا نظارہ کرتے ہیں اگر نہیں جاتے تو مسجد میں۔ جمیل کا کعبۂ مقصود مکے کی بجائے لندن نظر آتا ہے۔ آخر ہم اپنی کتابوں میں اپنی ثقافت، اپنے دینی عقائد اور اپنے مقدس مقامات کا ذکر کرتے ہوئے شرماتے کیوں ہیں؟ انگریزی زبان سکھانے کے لیے کیا ضروری ہے کہ رہن سہن اور ماحول بھی عین مین لندن یا نیویارک کا ہو۔

دوسری چیز جس کی کمی ہماری کتابوں میں کھٹکتی ہے وہ ہے تحریک پاکستان کے واقعات کا بیان — تحریک پاکستان کے اہم مراحل اور واقعات ہر درسی کتاب میں مناسب طریق سے بیان ہونے چاہئیں علاوہ ازیں اضافی کتب کا ایک سلسلہ تحریک پاکستان ہی پر مشتمل ہونا چاہیے جس میں پوری تحریک وضاحت کے ساتھ سلیس اور مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہو۔

تیسری چیز جس کی طرف میں اپنے معزز رفقاء اور مصنفین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ ہے انداز بیان — ہم اپنے قومی مشاہیر کے حالات اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے کسی تذکرے میں سوانحی خاکہ دیا ہو۔ بچوں کے لیے یہ انداز قطعاً غیر دلچسپ اور سیرت سازی کے نقطۂ نظر سے غیر مؤثر ہے۔ تاریخی حقائق کو روکھے پھیکے انداز میں پیش کرنا امتحانی تیاری کے لیے مفید ہو تو ہو، اس سے کردار سازی کا کام نہیں لیا جا سکتا — ہمارے اکثر اسباق کے انداز پیشکش میں اس جذباتی کیفیت اور قلبی وابستگی کی کمی نظر آتی ہے جو تحریر میں تاثیر کا جادو بھر دیتی ہے۔ نہ اخلاص کا رچاؤ نہ فن کا رکھ رکھاؤ۔ بس سپاٹ سا طرز بیان۔

اسی طرح کئی اصولی باتیں منطقیانہ انداز سے بیان کر دی جاتی

ہیں لیکن ان اصولوں کا بچوں کی زندگی سے رابطہ و تعلق واضح نہیں ہوتا ۔ اس کی مثال چھٹی جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک سبق ''پرچم کی عزت'' ہے جس میں اسلامی تاریخ کے تین واقعات الگ الگ بیان کر دیے گئے ہیں۔ لیکن کسی جگہ بھی طلباء کو پاکستانی پرچم کی طرف متوجہ نہیں کیا گیا ۔ حالانکہ یہ بات اتنی مشکل نہ تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ اصل متن میں ایسی گنجائش نہیں ہوتی ۔ ایسی صورت میں سبق کے آخر دی ہوئی مشقوں میں طلباء کو اس طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن افسوس تو اس امر کا ہے کہ ہمارے مصنفین درسی کتب میں مشقوں اور جائزے کی اہمیت سے بہت کم واقف ہیں ۔ عموماً ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جن سے رٹائی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے ۔ مثلاً اسی سبق میں پرچم کی عزت کے متعلق تمام سوالوں کے جوابات چند جملوں کو ہو بہو دھرا دینے سے پورے ہو جاتے ہیں ۔ مصنف نے بچوں کو یہاں بھی پاکستانی پرچم کی طرف توجہ دلانا ضروری نہیں سمجھا—اگر طوالت اور موضوع سے دور ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں چند مشقی سوالات تفنن طبع اور عبرت آموزی کے لیے ضرور پیش کرتا ۔

اس وقت سوئے اتفاق سے ہمارا ملک ایک شدید بحران سے دوچار ہے ۔ علاقائی اور لسانی تعصبات کو ہوا دی جا رہی ہے۔ بعض خود غرض عناصر ملک کی سالمیت پر ذاتی مفادات کو ترجیح دے رہے ہیں ۔ ان حالات میں اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی درسی کتابوں میں ایسی اقدار کا ذکر کریں جو محبت و مؤدت اور اسلامی اخوت کی راہیں ہموار کریں۔ ان اقدار میں بنیادی حیثیت تو بہرحال اسلام ہی کی ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری بنیادیں بھی تلاش کی جائیں ۔ مثلاً زبانوں کا احترام۔ ہمیں قومی اور علاقائی زبانوں کے صحیح مقام سے طلباء کو شناسا کرنا چاہیے ۔ انہیں ان زبانوں کے ان عناصر کی طرف بالخصوص زیادہ توجہ دلائیں جو زبانوں میں بھی اشتراک کی شہادت دیتے ہیں ۔ مثلاً ذخیرۂ الفاظ میں عربی فارسی الفاظ کا مشترک سرمایہ—علمی، ذہنی اور دینی پس منظر کی وحدت—

اسلامی تہذیب کی آئینہ داری وغیرہ۔ بہتر یہی ہے کہ سارے ملک میں دونوں قومی زبانیں لازمی طور پر پڑھائی جائیں لیکن جب تک ایسا ممکن نہ ہو ان کی مشترک خصوصیات سے طلباء کو ضرور شناسا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مرکزی اردو بورڈ کی یہ کوشش قابل تحسین ہے کہ اردو ، بنگلہ ، سندھی ، پشتو ، پنجابی ، بلوچی اور کشمیری زبانوں کے مشترک متبادل الفاظ پر مشتمل لغت تیار کی جائے۔

نظریۂ پاکستان کا تقاضا ہے کہ ہماری درسی کتب میں کوئی مواد ایسا نہ ہو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے نظریات و عقائد سے متصادم ہو ، یا اس سے تضحیک کا پہلو نکلتا ہو ، یا وطن کے کسی حصے کے متعلق غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہو ، یا اس میں اسلام اور مسلمانوں کا تمسخر اڑایا گیا ہو۔ کتابوں سے ایسی کہانیاں یا افسانے بھی قلم زد ہو جانے چاہئیں جو جرائم اور بد اعمالیوں کا جواز پیش کرتے ہوں ، جن میں فرنگی تہذیب اور غیر ملکی ثقافت کو پرکشش بنا کر پیش کیا گیا ہو ، جس سے ہمارے نوجوانوں کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔

درسی کتابوں میں جس معاشرت کے نمونے پیش کیے جائیں وہ پاکستانی معاشرت ہونی چاہیے۔ سبق کے کسی حصے میں ایسا مفہوم متبادر نہیں ہونا چاہیے کہ طالب علم کسی اور معاشرت کو بہتر سمجھنے لگے — جہازوں اور کاروں پر سیر کرنے والوں کے واقعات بچوں میں یا احساس کمتری پیدا کریں گے یا ناجائز ذرائع سے جلد از جلد دولت مند بننے کی خواہش کو جنم دیں گے۔

سامعین کرام!

میں اپنی گفتگو ختم کرنے سے پیشتر ایک دو اہم باتوں کا اعادہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ پرسوں کے اجلاس میں جناب جسٹس ایس۔ اے رحمان نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارا ایک نظریۂ پاکستان موجود ہے لہذا اب کسی مفکر یا مقرر کا یہ کہنا کہ "آیا ہمارا کوئی نظریہ بھی ہے" ، درست نہیں ، نظریۂ پاکستان کوئی

متنازع مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر بحث کی گنجائش ہو۔ یہ اسی طرح برحق ہے جس طرح صداقت اور ایمان۔ لہذا نظریۂ پاکستان کے متعلق اس قسم کی بحث نہایت ناروا ہے کہ پاکستان کا محرک کوئی نظریہ تھا یا نہیں؟ یہ طے شدہ مسئلہ ہے۔ بالخصوص طلباء کے سامنے اس قسم کے مباحث یا موضوعات رکھنا ان کے حق میں سم قاتل سے کم نہیں۔

دوسری بات جو محترم جسٹس صاحب نے ارشاد فرمائی وہ بھی نہایت بر وقت اور اہم ہے کہ درسی کتابوں میں نظریۂ پاکستان کا بیان تو ضروری ہے ھی لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھانے والا استاد ان نظریات پر ایمان رکھتا ہو۔ کیونکہ استاد کا ذاتی نظریہ بہرطور طلباء پر اثر انداز ہوگا۔ وہ نظریۂ پاکستان پر دیا ہوا سبق پڑھانے کے باوجود طلباء کو تشکیک کا مریض بنا سکتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ خود استاد کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ نظریۂ پاکستان کے مظاہر اور عناصر ترکیبی سے کماحقہ واقف بھی ہو اور ان پر ایمان بھی رکھے۔

——میں یہ بیان کرتے ہوئے بے حد فخر محسوس کر رہا ہوں کہ اسی جذبے کے تحت مرکز توسیع تعلیم لاھور کے زیر اہتمام ۱۸۔ اکتوبر سے ایک یک ماھی کورس کا آغاز ھو رہا ہے جس میں صوبے کے چالیس اساتذہ شریک ھوں گے اور کورس کا موضوع ''نظریۂ پاکستان،، ہوگا——خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ استاد کا اپنا طرز عمل اور طریق تدریس نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ چاہے تو موجودہ درسی کتب ھی میں نظریۂ پاکستان کی وضاحت کے لیے مناسب مواقع نکال سکتا ہے۔ مثلاً ایسے اسباق میں جیسے حمد، دعا، پرچم کی عزت، ھماری فضائیہ، میثاق استنبول، اسلام کی مجاھدات، مشرقی پاکستان کی سیر وغیرہ۔ یہ وہ اسباق ھیں جن کی مشقوں میں بھی موجودہ مصنفوں نے اس پہلو کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ البتہ استاد یہاں بات سے بات پیدا کر سکتا ہے——لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی کہ ھمارا اوسط درجے کا استاد عام طور پر تخیل و تخلیق کی صلاحیتوں سے محروم ہے۔ وہ ایسی باتیں

بہت کم سوچتا ہے اور یوں بھی وہ اپنا بوجھ کم سے کم کرنا چاہتا ہے جہاں مزید محنت کرنے کا سوال پیدا ہو وہاں سے بچ کر نکل جانے میں کمال رکھتا ہے۔ لہذا جہاں درسی کتابوں کے متن میں نظریۂ پاکستان سے متعلق مواد پیش کرنا ضروری ہے وہاں اساتذہ کے لیے ''رہنما کتابوں'' کی بھی اشد ضرورت ہے۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ اس تجویز کو اصولی طور پر قبول کر چکا ہے۔ توقع ہے کہ رہنما کتب یا معلم ایڈیشن لکھنے والے مصنف حضرات معلموں کے لیے ہر سبق میں ایسے اشارات اور سرگرمیوں کی نشاندھی کر دیں گے جن سے استاد کو نظریۂ پاکستان کو اجاگر کرنے میں مدد ملے۔

سامعین گرامی قدر!

اگرچہ ملکی فضا کے دھندلکے کبھی کبھی مایوسی کا سبب بنتے ہیں لیکن انہیں میں سے امید ورجا کی حسین کرنیں چھن چھن کو دلوں کو منور کرتی رہتی ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کا یہ مذاکرہ انہی کرنوں میں سے ایک ہے۔ اس مذاکرے میں بلند پایہ مؤرخوں اور عالموں کی شمولیت بجائے خود اس کی وقعت کی زندہ شہادت ہے۔ اس موقع پر نظریۂ پاکستان کے متعلق جس ایمان و یقین کا اظہار کیا گیا ہے وہ یقیناً ایک نئے جذبۂ عمل کا محرک ثابت ہوگا اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی جائے گی۔

میں صمیم قلب سے اس مذاکرے کے ارباب انصرام کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مفید اور قابل عمل اقدامات کے نفاذ میں یہ بورڈ حسب معمول پیش قدمی کرے گا۔

# ثانوی مدارس میں
# اردو کی تدریس

زبان انسانی تمدن کی ایک اہم بنیادی ضرورت ہے۔ انسانی معاشرے کے اجتماعی مفادات ہوں یا انفرادی حاجات، دونوں کو زبان کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ تہذیبی و ثقافتی اقدار، زبان کے طفیل اظہار کی راہ پاتی ہیں اور اسی کے سایۂ عاطفت میں گردش ایام سے پناہ حاصل کرتی ہیں۔ زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے فرد اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتا ہے اور معاشرے کی ترقی و پیش رفت میں مفید و مؤثر کردار ادا کرتا ہے—قومی اور اجتماعی اعتبار سے زبان ملت کے ماضی اور حال کے درمیان مضبوط رشتہ استوار کرتی اور افراد میں قومی شعور کو فروغ دے کر ان میں خیال و عمل کی ہم آہنگی پیدا کرتی ہے—علم کی ترویج اور فنی مہارتوں کی اشاعت کا ذریعہ بھی زبان ہے اور چونکہ تعلیم کا مقصد بھی علم کو پھیلانا اور قومی اقدار کا تحفظ ہے اس لیے زبان اور عمل تعلیم لازم و ملزوم ہیں۔ قومی تعلیمی کمیشن نے تعلیم میں قومی زبان کی اہمیت کی چند وجوہ منضبط کی ہیں جو قابل التفات ہیں۔

اول : یہ کہ قومی شعور کی نشو و نما میں زبان ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے قومی سطح پر وحدت خیال جنم لیتی ہے۔ لہذا قومی زعماء، ترانے اور پرچم کی طرح قومی زبان بھی جذبہ افتخار اور عزت و احترام کی علامت ہے۔

دوم : تعلیم میں قومی زبان کے استعمال سے دانشوروں اور عوام الناس میں یک زبانی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے ایک تو معاشرے میں طبقہ واریت ختم ہو جاتی ہے جس کی بنیاد

محض لسانی اختلاف پر ہے ۔ دوسرے قومی مفکرین و مصلحین کی ثقافتی، علمی اور ادبی تحصیلات تک سب کی براہ راست رسائی ہوتی ہے ۔ قومی زبان کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کی تحصیل کم وقت چاہتی ہے اور جو وقت اور محنت کسی دوسری زبان کے حصول میں صرف ہو رہی ہے وہ علوم کے حصول کے لیے خرچ ہو سکتی ہے ۔ نیز طلباء میں تخلیقی اظہار کی صلاحیتیں اجاگر ہو سکتی ہیں ۔

قومی زبان میں علوم و فنون کو اس طرح ترقی دینے کا ایک اور مفید پہلو یہ ہے کہ علمی اور فنی کتب کا مطالعہ عوام کے لیے بھی آسان ہوگا اور پورا قومی ذہن ترقی پذیر ہوگا ۔ یہ وہ چند بنیادی عمومی مقاصد ہیں جن کے تحت نصاب مدرسہ میں اردو کو خصوصی اہمیت کا مستحق سمجھا گیا ہے ۔

تقسیم ملک سے قبل بھی اردو زبان مدارس میں مضمون تدریس کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی ۔ لیکن ذریعۂ تعلیم انگریزی تھی اور اردو کو ورنیکلر زبان کا درجہ حاصل تھا ۔ اسی لیے اردو کو تدریسی سہولتوں سے بھی محروم رکھا گیا ۔ تشکیل پاکستان کے فوراً بعد ارباب تعلیم نے محسوس کیا کہ غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے جاری رکھنا قومی تقاضوں کے منافی ہے اس لیے پہلے مرحلے میں دسویں جماعت تک اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ۔ لیکن مضمون تدریس کے اعتبار سے اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت دی گئی ۔ اس پر طرہ یہ کہ اردو کو سائنس ، ڈرائنگ کے بالمقابل رکھا گیا ۔ عموماً قابل اور لائق طلباء اور دور اندیش والدین سائنس کو ترجیح دیتے اور طوعاً و کرھاً اردو سے محروم رہتے ۔ ان اختیاری مضامین کے مقابلے میں بھی اردو کو بہت کم تدریسی سہولتیں حاصل تھیں — اور یوں اردو قومی زبان ہوتے ہوئے بھی ایک اچھوت کی سی حیثیت رکھتی تھی ۔

۱۹۶۱ء میں اردو کو ثانوی درجہ تک لازمی مضمون کی حیثیت دے دی گئی جو درحقیقت ایک اہم قومی تقاضا تھا اور موجودہ

نصاب میں اعلیٰ ثانوی درجے تک اردو زبان کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب یا اعلیٰ اردو کو اختیاری مضمون کے طور پر شامل نصاب کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کم از کم ثانوی درجے تک اردو کو وہ منصب دیا جا چکا ہے جو اسے قومی زبان کے طور پر حاصل ہونا چاہیے تھا—اب وہ نہ صرف ذریعۂ تعلیم ہے بلکہ لازمی اور مرکزی مضمون تدریس بھی ہے۔

قومی زبان کو تعلیم میں نمایاں مقام دینے کے حق میں جو سب سے اہم دلیل دی جاتی ہے وہ یہی ہے کہ قومی جذبات کی تسکین کے علاوہ معیار تعلیم بھی بہتر ہو جائے گا۔ بالخصوص جب کہ مدارس میں ایک غیر ملکی زبان کو بالاتر منصب حاصل ہو۔ جس کی تحصیل ہی میں طلباء کی عمر عزیز کا قیمتی حصہ رائیگاں جاتا ہے—لیکن اردو زبان کے سلسلے میں ہمیں سنجیدگی سے اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا اب اردو کی وساطت سے ہم اپنے معیار تعلیم کو بہتر بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

میری رائے میں اس سوال کا جواب اتنا سادہ نہیں کہ برجستہ ہاں یا نہ کہہ کر فیصلہ دے دیا جائے لیکن ایک حقیقت جس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ معیار تعلیم سے بہت کم لوگ مطمئن نظر آتے ہیں اور اس کی دیگر وجوہ کچھ بھی ہوں ایک وجہ لازماً یہی ہے کہ ہمارے مدارس میں زبان کی تدریس ابھی تک معیاری نہیں اور ثانوی درجے کا طالب علم زبان کے استعمال پر قادرانہ تصرف نہیں رکھتا۔ اس امر کی وضاحت کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ثانوی درجے میں تدریس اردو کے مقاصد کا بھی بغور جائزہ لیا جائے تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ ہمارے مدرسوں میں جن مقاصد کے حصول کے لیے جو طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں کیا وہ واقعی مفید مطلب ہیں؟

نصابی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ثانوی درجے میں تدریس اردو کا مقصد اول یہ ہے کہ اردو کو زندہ اور ترقی پذیر زبان کی حیثیت

سے پڑھایا جائے۔ اس مقصد کا تقاضا یہ ہے کہ ثانوی درجے کے طالب علم میں یہ شعور پیدا ہو کہ ہماری زبان محض کتابی زبان نہیں ۔ یہ محض دفتر پارینہ نہیں بلکہ درحقیقت ایک زندہ و متحرک زبان ہے جو زندہ معاشرے میں صدیوں کا سفر طے کرتی ، مختلف علاقوں میں پھرتی پھراتی ، ہم تک پہنچی ہے اور اس نے اپنے سفر کے ہر مرحلے میں اپنے گرد و پیش کی آئینہ داری کی ہے اور ہر دور کے تقاضوں کو اپنے اندر سمویا ہے—وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دامن کو وسیع تر کیا ہے—غرض اس طرح اس نے ماضی کا تمام ورثہ ہم تک کامل ایمانداری سے پہنچایا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی اس میں صلاحیت موجود ہے ۔ یہ محض غزل و قصیدہ اور شعر و شاعری کی زبان نہیں بلکہ اس میں علم و فن بھی ہے اور فکر و نظر بھی ۔ اس کی ایک حیثیت کلاسیکی بھی ہے اور دوسری جدید زبان کی بھی—لیکن افسوس کہ ہماری تدریس یہ روح پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ۔ طلباء اردو کو بھی ایک خالص درسی اور امتحانی مضمون کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں ۔ انہیں صرف انہی حصوں سے سروکار ہے جن کا امتحان میں پوچھے جانے کا امکان ہے ۔ درسی کتابوں کا حال بھی قابل رشک نہیں ۔ نظم و نثر کا جو انتخاب اس وقت ثانوی درجے میں ہے اس سے غیر شعوری طور پر طالب علم یہ تاثر لیتا ہے کہ علمی نثر ، دور سرسید تک ہی پہنچ پائی اور نظم میں اقبال کے بعد اردو کی نشو و نما مکمل ہو گئی ۔ اس کے بعد یا تو علمی مسائل وجود ہی میں نہیں آئے یا اردو زبان ان صلاحیتوں سے محروم ہے ۔ یہ بھی بدنصیبی کی بات ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس دور کے مسائل کو تدریسی معیاروں کے مطابق لکھنے کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں ۔ سائنسی فکر کو ادبی انداز میں سمو کر پیش کرنے والے سرے سے نہیں ہیں یا درسی کتابیں مرتب کرنے والے انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے ۔ یہ امر محتاج وضاحت نہیں کہ ہمارے ہاں دنیائے تعلیم میں امتحان پوری طرح سے مسلط ہے ۔ استاد ایک حد تک مجبور ہے کہ اپنے طریقہ ہائے تدریس کو امتحانی تقاضوں کے مطابق ڈھالے—امتحانی

پرچہ مرتب کرنے اور پرچے جانچنے والے بھی زبان کو زندہ و متحرک دیکھنے کے بہت کم خواہاں ہیں ۔ چند رسمی سوالات اور ان کے رٹے رٹائے جوابات——روایتی و فرسودہ موضوعات پر مضمون، غیر حقیقی اور غیر شخصی مکتوبات، گرامر کے چند قاعدے——اور بس——اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گائیڈوں اور گیس پیپروں کی مدد سے چند ہفتے رٹائی کر لینے والا طالب علم اچھی بھلی پوزیشن لے کر کامیاب ہو جاتا ہے ۔ لیکن کیا وہ اردو زبان پر قدرت بھی رکھتا ہے اور اردو کی برکات سے مستفید ہونے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہے ؟ ——یہ بات محتاج ثبوت ہے ۔

اردو کی زندگی اور ترقی پذیری کا صحیح نقش جمانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کو ہماری قومی زندگی میں منفرد اور نمایاں حیثیت حاصل ہو۔ یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان کثیر اللسانی ملک ہے ۔ مختلف علاقوں کے طلباء جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے ، جب انہیں اپنے قریبی ماحول میں اردو کے بجائے علاقائی زبان ہی سے واسطہ رہتا ہے اور دوسری طرف سرکاری اور عدالتی سطح پر انگریزی کو مسند فضیلت پر بیٹھا دیکھتے ہیں اور خود مدرسے کے اندر بھی انہیں اردو زبان کی بالاتری نظر نہیں آتی تو بجا طور پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اردو ایک مکتبی زبان ہے ، جس کے بغیر بھی گذارہ ہو سکتا ہے ۔ اگر ہم قومی زبان کی عالی منصبی کے دل سے قائل ہیں تو ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اردو کو سب کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بنا دیں ۔ کوئی اعلیٰ طبقے کا فرد ہو یا غریب گھرانے کا سپوت ، ہر ایک کے لیے اردو کے بغیر سماجی ، معاشرتی اور علمی دنیا میں معزز مقام کا حصول ناممکن ہو جائے۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری مراسلات ، احکام و قوانین ، عدالتی کارروائی اور فیصلے ، اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات اور انٹرویو——غرض ہر جگہ اردو کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ ورنہ زندگی کو معاشی معیاروں پر جانچنے والے لوگوں کے لیے اردو کی زندگی اور ترقی پذیری کا ثبوت مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ثانوی درجہ میں تدریس اردو کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ طلباء کی تقریر و تحریر میں صحت ، وضاحت اور سادگی کی خوبیاں موجود ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ مدارس میں تحریری کام کی طرف اتنی توجہ ضرور دی جاتی ہے ، جس سے امتحانی ضروریات پوری ہو سکیں لیکن تحریر میں ذاتی اسلوب پیدا کرنے یا اپنے ما فی الضمیر کے آزادانہ اظہار کی تربیت کے مواقع برائے نام ہیں۔

امتحانوں میں بھی چونکہ رٹے ہوئے مواد سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اساتذہ طلباء کی تحریر میں انفرادیت ، جدت اور حسن بیان کی خوبیاں پیدا کرنے کی سرے سے کوئی سعی نہیں کرتے۔ یہ تو ہوا تحریر کا حال۔ تقریری زبان کا پہلو اس سے بھی گیا گذرا ہے۔ چونکہ لب و لہجہ ، تلفظ اور صحت اظہار اور روانی زبان کا امتحان نہیں ہوتا لہذا معلم زبان اس کام کو سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدارس میں تقریری مقابلے بھی ہوتے رہتے ہیں ، لیکن ان کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے۔ چند خوش قسمت طلباء ہوتے ہیں جو ایک بار صف اول میں پہنچ کر نمایاں حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ استاد کی نگاہ فیض اثر انہی پر مرکوز ہوتی ہے۔ لیکن طلباء کی باقی جمیعت کو بیان و اظہار کے مواقع نہیں ملتے۔ حد یہ ہے کہ نظم و نثر خوانی میں بھی (جو کتابی تدریس کا جزو لازم ہے) سبھی طلباء کو شریک نہیں کیا جاتا اور ایسے طلباء کی کمی نہیں جو چھٹی جماعت سے منہ بند کر کے بیٹھتے ہیں اور اسی طرح مہر بلب تعلیمی ادارے سے سند فراغت لے کر چلے جاتے ہیں۔ بلکہ استاد کے غلط رویے کے باعث بعض طلباء محرومی سے ہمکنار ہو کر یقین کر لیتے ہیں کہ انہیں نہ پڑھنا آتا ہے نہ بولنا——اور درحقیقت انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ طلباء میں تحریر و تقریر کی خوبیوں کو اجاگر کرنے اور صحیح لب و لہجہ و تلفظ سکھانے کے لیے معلم اردو کا نمونہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ تحصیل زبان محض درسی کتاب سے ممکن نہیں۔ زبان زندگی کا جزو ہے۔ اس لیے اس کی تدریس بھی زندہ و متحرک حیثیت سے ہونی چاہیے۔ جب تک معلم اپنے

حسن اظہار سے تدریس کو مزین نہ کرے اس میں جوش و اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ خوش گوئی و خوش خوانی کی صفات بھی تربیت و مشق کی محتاج ہیں اور اگر استاد خود ان سے محروم ہو تو کار طفلاں تمام خواهد شد۔

خوش خوانی و خوش بیانی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی امتحانی اهمیت بھی ہو—بیس یا پچیس فی صد نمبر اردو کے تقریری امتحان کے لیے رکھے جا سکتے ہیں۔ جس میں نظم و نثر خوانی بھی شامل ہو اور آزادانہ گفتگو اور تقریر بھی۔ اس طرح لسانی خوبیوں کے علاوہ طالب علم کی جودت طبع، انفرادیت، شخصی وقار، بدیہہ گوئی یا حاضر جوابی کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے—اس میں شک نہیں کہ میری اس تجویز کا عملی اجراء بہت سی مشکلات کا باعث بھی ہے لیکن ارباب دانش اس کے لیے موزوں طریق کار وضع کر سکتے ہیں—اور جس طرح سائنس کے عملی امتحان لیے جاتے ہیں، اسی طرح سے اردو کا تقریری امتحان بھی لیا جانا ممکن ہے—یہ حقیقت ہے کہ جب تک ہماری تعلیم میں امتحان کو بالاتر حیثیت حاصل ہے اس وقت تک ان مقاصد کے حصول کا مناسب ذریعہ ''امتحان'' ہی ہے۔

تدریس اردو کا ایک اور مقصد طلباء میں اپنے ادب و ثقافت پر تفاخر کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کا تقاضا یہ ہے کہ چمنستان ادب سے ایسے گلہائے سدا بہار منتخب کیے جائیں جو طلباء کے ملی، دینی اور ثقافتی جذبات کی کامل آئینہ داری کرتے ہوں۔ تاکہ انہیں اپنے ادب کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی ہو۔ جب تک یہ جذباتی لگاؤ پیدا نہ ہوگا اس پر فخر کا جذبہ آبھرنا ممکن نہیں—یہ ذمہ داری درسی کتاب کے مرتب کی بھی ہے اور معلم اردو کے انداز تدریس پر بھی اس کا انحصار ہے کہ وہ طلباء کو موزوں اور پرتاثیر ادب سے محبت کرنا سکھائیں۔ ان کے دلوں میں اپنے ادباء و شعراء کی عظمت کا نقش اجاگر کریں اور ادبی اقدار کے استحسان کے ساتھ ساتھ ان میں مذاق سلیم پیدا کریں۔

یہ مقصد متعین کرتے وقت ارباب تعلیم کے ذہن میں یہ خیال جاگزین تھا کہ غلامی کے طویل دور نے ہمیں اپنی ثقافت، ادب اور تہذیب سے نہ صرف دور کر دیا ہے بلکہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی انگریزی سے بے پناہ مگر بے بنیاد محبت نے ان میں اپنی چیزوں کی بے وقعتی کا احساس ابھارا ہے۔ انگریزی ادب کا طالب علم شیکسپئیر، شیلے، کیٹس کی شاعرانہ عظمت سے مرعوب ہے اگرچہ وہ انہیں براہ راست سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ یورپی ناقدوں کا معترف ہے، حالانکہ اس کی اپنی تنقیدی نگاہ مشکوک ہے۔ اسی مرعوب ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اردو کا نام آتے ہی شعر و شاعری کا نہایت محدود تصور ذہن میں ابھرتا ہے اور اردو ادب میں انہیں سوائے قصیدے کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ انہیں میر کی درد مندی، درد کا خلوص، آتش کی صناعی، غالب کی بالغ نظری، حالی کے اجتماعی شعور، اکبر کی ناقدانہ بصیرت اور اقبال کے عالمگیر پیغام میں کہیں جاذبیت نظر نہیں آتی — واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ذہن پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے اور بقول اکبر

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی
بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

لارڈ میکالے نے انگریزی ادب اور مشرقی علوم کا موازنہ کرتے ہوئے آج سے قریباً ڈیڑھ صدی پہلے جو تعلی کی تھی، افسوس کہ ہم عملاً اسی کی تقلید و تائید کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ طلباء کو صحت مند اور قابل فخر ادبی روایات سے روشناس کرایا جائے۔ انہیں اردو ادب کی زندہ رہنے والی اقدار سے محبت کرنا سکھایا جائے۔ جوں جوں اس محبت کی جڑیں پختہ ہوں گی ادب و ثقافت پر تفاخر کا جذبہ از خود ترقی پذیر ہوگا۔

ثانوی درجے میں تدریس اردو کا ایک اور اہم مقصد یہ ہے کہ طلباء اپنے خیالات و احساسات کا تخلیقی اظہار کر سکیں۔ درحقیقت یہ مقصد تدریس زبان کا ماحصل ہے — لیکن یہی وہ پہلو ہے جو ابھی تک ہمارے مدارس میں پوری توجہ کا مستحق نہیں بن سکا۔ ثانوی

درجہ کے نصاب میں انشاء پردازی کے تحت چند خطوط اور کچھ مضامین ضرور لکھوائے جاتے ھیں لیکن تخلیقی اور انفرادی اظہار کے مواقع سرے سے مہیا نہیں کیے جاتے، بلکہ معلم کی تمام تر توجہ کا مرکز درسی کتاب ھے۔ اس کا ایک جواز بھی ھے۔ اول یہ کہ امتحان میں زیادہ نمبر پڑھے ھوئے مواد ھی کے لیے وقف ھوتے ھیں۔ بچے بھی اسی کو ضروری خیال کرتے ھیں۔ دوم معلم کی رفتار کارکردگی کا جائزہ بھی کتاب کے صفحات سے لگایا جاتا ھے۔ اس کے برعکس انشا پردازی کے لیے کوئی متعین نصاب نہیں ھے نہ مضامین کی مقدار و نوعیت ھی مقرر ھوتی ھے۔۔ بہت کم اساتذہ ھوں گے جو طلباء کی آزادانہ انشاء کے لیے مناسب رھنمائی کرتے ھوں ورنہ اس کام کے لیے صرف اور صرف گائیڈوں اور بازاری کتابوں کا انتخاب کیا جاتا ھے ــــ حد یہ ھے کہ ایسے موضوعات بھی جو بچوں کے قریبی ماحول اور مشاھدے سے تعلق رکھتے ھیں کتابوں ھی سے رٹوائے جاتے ھیں۔ تاریخی مقام کی سیر، عید، میلہ، کوئی حادثہ، میری زندگی کا یادگار واقعہ، پکنک، ریل کا سفر وغیرہ ایسے موضوعات ھیں کہ استاد کی معمولی سی توجہ طلباء کو اپنے خیالات و مشاھدات کے اظہار میں رھنمائی کر سکتی ھے اور یہی وہ طریقہ ھے جو طلباء کے تخلیقی اظہار میں ممد و معاون ھو سکتا ھے ھمارے غلط طریق تدریس کا یہ نتیجہ ھے کہ نہ صرف ثانوی درجے کے طلباء بلکہ اعلیٰ درجوں کے طلباء بھی اعتماد علی النفس کی نعمت سے محروم ھیں۔ وہ لکھی ھوئی عبارات کو سند آخر سمجھتے ھیں خواہ اس کا علمی و ادبی درجہ کچھ بھی ھو۔ اقبال کو انہی طلباء سے گلہ ھے کہ کتاب خواں ھے مگر صاحب کتاب نہیں۔

اگر ھمیں صاحب کتاب طلباء پیدا کرنے ھیں تو ناگزیر ھے کہ انہیں ذھنی آزادی اور اپنی ذات پر اعتماد کی دولت سے مالا مال کیا جائے ــــ بچوں کے اپنے مطالعے اور مشاھدے سے ابھرنے والے خیالات و احساسات کو مناسب اھمیت دی جائے اور انہیں انفرادی اسلوب اپنانے کی ترغیب دلائی جائے۔

انشاء پردازی کی علمی، ادبی اور لسانی اھمیت متقاضی ھے کہ

تدریس زبان کے اوقات میں سے وقیع حصہ اس پر صرف کیا جائے——اس وقت ہمارے مدارس میں مضمون نویسی کے لیے مختلف علمی ذخائر سے استفادہ کرنے، حسب حال نکات کو اخذ کرنے، مناسب خیالات کو عمدگی سے ترتیب دینے، محاورے، روزمرے، شعر و امثال کو برمحل استعمال کرنے کی مشق نہیں کرائی جاتی اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر طلباء کے ذہن خلاقی و براقی سے مزین نہیں ہو سکتے اور یہی صفات تدریس زبان کی معراج ہیں۔

مذکورہ مقاصد کی تحصیل میں معلم اردو کا کردار بہرحال مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک اردو کا معلم علم و فضل کے ساتھ مہارت تدریس سے بہرہ ور نہ ہو ممکن نہیں کہ وہ ان کے حصول میں اپنا فریضہ انجام دے سکے۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ماہرین تعلیم کے مقرر کردہ مقاصد تدریس محض کتابوں کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں۔ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے اساتذہ میں سے بمشکل ایک فی صد ایسے ہوں گے جنھوں نے نصابی کمیٹی کے سفارش کردہ ان مقاصد کا مطالعہ بھی کیا ہو——اور جنہیں مطالعے کا شرف نصیب ہوا ہے، ان میں سے شاید ہی کوئی معلم ایسا ہو جو ان مقاصد کے مقتضیات سے پوری طرح واقف ہوا ہو——یہاں ایک اور کوتاہی کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا——تدریس اردو کے مقاصد انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرتبین نصاب اس امر کے خواہاں ہی نہیں کہ استاد اردو ان سے پوری طرح شناسا ہو۔ وہ اس فہرست کو صرف مرتبین نصاب تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان مقاصد کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام اعلیٰ ادبی، تہذیبی اور قومی اقدار کو نہایت حسن و خوبی سے ان میں سمو دیا گیا ہے لیکن اس میں بہت سی ایسی اصطلاحات موجود ہیں جن کی عملی شکل کا تعین کرنا بھی ضروری ہے۔ ”زندہ زبان“، زبان کے قومی تقاضے، ادبی استحسان، پختگیٔ کردار اور ذوق جمالیات وغیرہ بہت ہی دلکش اور دلفریب تراکیب ہیں، لیکن جب تک ہم معلم اردو کو ان کے مفاہیم، ان کے اطلاق اور ان کے حصول کی تدابیر

سے روشناس نہ کرائیں کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ ہماری تدریس سے وہ مفادات و برکات بھی حاصل ہوں جو قومی زبان کی تدریس سے متوقع ہیں ۔ ماحصل اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ ثانوی درجے میں اردو کو ثانوی اعتبار سے بلاشبہ وہ منصب دیا جا چکا ہے جس کی وہ مستحق ہے لیکن ابھی ہم ان راہوں پر گامزن نہیں ہو سکے جو صحیح معنوں میں تدریس زبان کی اعلیٰ منازل کی طرف رہبری کرتی ہیں ۔ اس غرض کے لیے جہاں معلم اردو کی بہتر قابلیت اور مؤثق مہارت تدریس درکار ہے وہاں اچھی درسی کتابوں کی بھی ضرورت ہے ۔ اس کے علاوہ ثانوی درجہ کے طلباء کی جذباتی ، نفسیاتی اور علمی تشنگی کو سیراب کرنے اور حصول علم کی مزید پیاس بڑھانے کے لیے درسی کتب کے علاوہ صحت مند ادب کی کمی بری طرح محسوس کی جا رہی ہے ۔ اس وقت زائد مطالعہ کو مدرسے کی ذمہ داری سے خارج سمجھا جاتا ہے ۔ مدارس میں لائبریریاں محض رسمی اور قانونی ضروریات کو پورا کرتی ہیں ۔ اساتذہ ہمہ وقت طلباء کو درسی کتاب کے ساتھ ہی دست و گریباں دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔ خود اساتذہ کا مطالعہ محدود ہے ۔ اچھی کتابوں کا فقدان نہ سہی لیکن عمر اور درجے کی مناسبت سے ان کا انتخاب اور پھر طلباء کو ان سے متعارف کرانے کا کام سرے سے نہیں ہو رہا—اب ہمارے بچے یا تو کچھ نہیں پڑھتے یا ایسی کتابیں پڑھتے ہیں جو نہ صرف ان کی اخلاقی و علمی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتیں بلکہ انہیں گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں ۔ اس طرح ہمارا دوہرا نقصان ہو رہا ہے ۔

اس مقالے کے خاتمے پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو کی ترقی کے لیے چند ایسی تجاویز پیش کروں جنہیں محض ہیڈ ماسٹر صاحب کی نظر التفات ہی عملی جامہ پہنا سکتی ہے ۔

اول : جہاں تک ممکن ہو اردو کی تدریس کے لیے ایسے استاد کو مقرر کیا جائے جو نہ صرف اردو پڑھانے کی خصوصی تربیت سے بہرہ ور ہو بلکہ اردو زبان و ادب کا وسیع مطالعہ رکھتا ہو اور ذوق سلیم سے بھی متصف ہو۔

اردو زبان کی قومی عظمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اردو پڑھانے کی ذمہ داری خود لیں اور اسے بطریق احسن نبھائیں جس طرح انگریزی کے سلسلے میں عام روایت رہی ہے۔ اس طریق سے اساتذہ اور طلباء سب کی نگاہ میں اردو کا وقار بلند ہو جائے گا۔

دوم : اردو کو مدرسے کے وقت نامے میں تیسرے درجے کے مضمون کی سی حیثیت نہ دی جائے بلکہ اسے مناسب تعداد میں پیریڈ دیے جائیں اور ان پیریڈوں کا تعین بھی دن کے موزوں حصے میں کیا جائے۔

سوم : طلباء اور اساتذہ کی ذہنی بالیدگی اور ان میں اردو کا صحیح شعور اور ذوق پیدا کرنے کے لیے معیاری کتب کی فراہمی از بس ضروری ہے۔ اس معاملے میں ہیڈ ماسٹر صاحبان اگر تھوڑی سی توجہ فرمائیں تو کتب خانے کی الماریاں طالبان علم و ادب کے لیے وا ہو سکتی ہیں۔

---

# پڑھنے کی اہمیت
# اور اس کے مدارج

ابتدائی مدارس کے نصاب میں پڑھنے کو ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ایک عام شہری بچے کو مدرسے میں اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا سیکھ جائے۔ جو بچہ مدرسے میں پڑھنا نہیں سیکھ پاتا وہ یا مدرسے سے دل برداشتہ ہو کر بھاگ جاتا ہے یا پھر اس کے والدین اسے مدرسے سے اٹھا کر کسی کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ گویا پڑھنے میں مہارت حاصل کرنا نہ صرف طالب علم کی کامیابی کا معیار سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ اس کی آئندہ تعلیم کے جاری رکھنے کی ضمانت بھی ہے۔ آج ہمارے ابتدائی مدارس میں تعلیم کو ادھوری چھوڑنے (Drop-out) کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ بعض اندازوں کے مطابق ساٹھ سے اسی فی صد تک طلباء ابتدائی جماعتوں میں تعلیم کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ من جملہ اور وجوہات کے اس ضیاع کی ایک وجہ پڑھنے میں کمزوری ہے۔ پڑھنے کی مہارت پیدا کرنے میں بار بار ناکام ہونے کی وجہ سے بچہ جماعت میں نکو بن جاتا ہے اور یہی چیز اس کی مایوسی اور ذہنی اُلجھنوں کا موجب بن جاتی ہے۔ مغربی ممالک کے ثانوی مدارس میں بھی طلباء کی ایک کثیر تعداد تعلیم سے متنفر ہو کر مدرسوں سے بھاگ جاتی ہے۔ اس تعلیمی تنفز اور ضیاع کے مسئلے پر کئی تحقیقات ہوئیں۔ محققین اس بات پر متفق ہیں کہ دوسرے اسباب سے قطع نظر بچوں میں قرأت کی کمزوری ان کے سکول سے بھاگ جانے کا بہت بڑا سبب ہے۔ مدارس میں تحصیل قرأت کے مؤثر اقدامات کے اجراء سے اس ضیاع کو کسی حد تک روکا جا سکتا ہے۔

معیاری تعلیم (Quality Education) قرأت کی مہارت سے وابستہ

ہے - بچے کی اُستعداد قرأت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس کی تعلیمی بلندی یا پستی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے - جو بچے پڑھنے میں ھوشیار ھوں وہ بالعموم جملہ تدریسی مضامین میں بھی اچھے ھوتے ھیں - اس کے برعکس جو بچے قرأت میں کمزور ھوتے ھیں وہ اپنی ذھنی صلاحیتوں کے باوجود کمزور رھتے ھیں - جدید تحقیق سے اس مفروضے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ قرأت میں استعداد تعلیمی کامیابی کی کلید ہے -

بچے کی شخصیت کی بالیدگی اور اس کے معاشری ارتقاء (Social development) کا اس کی استعداد قرأت سے قریب کا تعلق ہے - فرانسس بیکن (Francis Bacon) کا مشہور قول کہ پڑھنے سے شخصیت کی تکمیل ھوتی ہے (Reading maketh full man) بڑی صداقت کا حامل ہے - بچہ کیا پڑھتا ہے ، کس طرح پڑھتا ہے اور کس قدر پڑھتا ہے ، یہ وہ عناصر ھیں جو بچوں کی شخصیتوں کو متنوع اور مخصوص سانچوں میں ڈھالتے ھیں ، ان کے کردار کو متعین کرتے ھیں اور ان کے رجحانات ، نظریات اور خیالات پر گہرے نقش چھوڑتے ھیں - نئی تحقیقات کے مطابق شخصیت کی نشو و نما پر اثر انداز ھونے والے جملہ عوامل قرأت کے ساتھ ایک مثبت رشتے (Positive correlation) میں منسلک ھیں -

قرأت کا فن اور اس میں مہارت ، ایک معاشری آلہ (Social tool) ہے - اس کی مدد سے سماجی شعور کی پرداخت ھوتی ہے اور اس کے ذریعے بچے شہری اخلاق سے روشناس ھوتے ھیں - قرأت سے ھمارے ثقافتی تصورات (Cultural concepts) فروغ پاتے ھیں - ان کی مدد سے ذوق استحسان کی تہذیب ھوتی ہے اور تنقیدی شعور بیدار ھوتا ہے - یہ کہنا بالکل درست ھوگا کہ پڑھنے کے فن ھی کا یہ کرشمہ ہے کہ ھمارے تہذیبی ورثے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ھوتے چلے آئے ھیں -

انسانی تعصبات اور نظریات خاصی جامد (Static) قسم کی چیزیں ھیں ، لیکن تحقیق کی رو سے جو چیز ان پر سب سے زیادہ اثر انداز ھوتی ہے وہ کسی شخص کے پڑھنے کی اھلیت ، اور اس کا مذاق قرأت ہے - گویا

قرأت ایک ایسا مؤثر حربہ ہے جو لوگوں کے نظریات میں انقلاب لا کر ان کے تعصبات میں ایک خوشگوار تبدیلی لا سکتا ہے ۔

موجودہ جمہوری دور میں پڑھنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ جن ممالک میں شہریوں کی اکثریت ناخواندہ ہے ان میں نہ سیاسی شعور بیدار ہوتا ہے اور نہ وہ جمہوریت کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں ۔

تشکیل شخصیت کے سلسلے میں پڑھنے کی جو افادیت ہے اس کے پیش نظر جملہ تعلیمی درسگاہوں میں بالعموم اور ابتدائی مدارس میں بالخصوص اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں قرأت کے ایک ایسے منظم اور مؤثر لائحہ عمل کے رائج ہونے کا اہتمام کیا جاتا ہے جو طلباء کی قرأت میں کامیابی کی ضمانت دے سکے اور قرأت کی اہلیت اور نفس مضمون کو ہر بچے کی استعداد اور صلاحیت سے ہم آہنگ کرے ۔ امریکہ کے تعلیمی منشور میں یہ بات بڑی صراحت سے درج ہے کہ قرأت کی اہلیت پیدا کرنا جملہ مضامین کی تعلیم سے زیادہ اہم ہے اور مدارس کا فرض ہے کہ وہ قرأت کی تدریس کے انتظامات کو فوقیت دیں[1] ۔

قرأت کا عمل جس قدر سادہ اور سہل معلوم ہوتا ہے ، حقیقت میں اس کا سیکھنا اتنا ہی مشکل اور پیچیدہ ہے ، اس لیے کہ اس عمل میں صرف ایک مہارت نہیں ، مہارتوں کا ایک مجموعہ درکار ہے جن پر عبور حاصل کیے بغیر اس فن میں کمال پیدا نہیں ہوتا ۔ قرأت کے ظاہری اور میکانکی عمل میں ایک سے زیادہ مہارتیں مطلوب ہیں ۔ مثلاً آنکھوں کو عبارت پر مرکوز (Focus) کرنا ، پھر ان کا عبارت کے ساتھ ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھمانا ، الفاظ کا مشاہدہ کرنا ، ملتے جلتے الفاظ کی شکلوں میں امتیاز کرنا ، الفاظ کے سمعی تصور کو ان کے بصری تصور سے ہم آہنگ کرنا ، عبارت کو صحت تلفظ اور مناسب رفتار سے پڑھنا اور مضمون کی نوعیت کے مطابق قرأت کی رفتار کو کم و بیش

1. Johan Gardener, "National Goals in Education" *Goals for Americans*, The Report of the President's Commission on National Goals. (New York: The American Assembly, Columbia University, 1960, p. 86).

کرنا ، یہ سب ایسی مہارتیں ہیں جن کا عمل قرأت سے گہرا تعلق ہے ۔ جب تک قاری کو ان مختلف مہارتوں پر قدرت حاصل نہ ہو، پڑھنے کے ظاہری تقاضے پورے نہیں ہوتے ۔

مذکورہ بالا مہارتیں (Skills) قرأت کے خارجی محاسن کو واضح کرتی ہیں ، لیکن قرأت محض ایک خارجی عمل کا نام نہیں ، بلکہ یہ ایک داخلی عمل ہے ، جو قاری کے ذہن کے ڈانڈے مصنف کے ذہن سے ملاتا ہے ۔ اس عمل کے کچھ فکری لوازمات اور کچھ تخیلی تقاضے بھی ہیں ۔ پڑھنے کا عمل دراصل ابلاغ (Communication) کا دوسرا نام ہے ۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں قاری صاحب مضمون سے ہم کلام ہوتا ہے ۔ اس کے پیش کردہ نکات کو سمجھتا اور اس کے خیالات سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔ وہ عبارت کے ساتھ ساتھ سوچتا چلا جاتا ہے ۔ اس کی اس فکر میں اس کے سابقہ تجربات کو بھی دخل ہوتا ہے ۔ وہ اپنے تجربات کے تناظر (Perspective) میں مصنف کی باتوں کو سمجھتا اور ان کی تعبیر کرتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر قرأت کا عمل اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ قاری صرف مصنف کے نقطۂ نظر ہی سے وقوف حاصل نہیں کرتا بلکہ سابقہ معلومات اور تجربات کی روشنی میں ان نظریات کی صحت کو پرکھتا بھی ہے ، ان کی افادیت پر غور کرتا ہے ، زندگی کے مسائل کے حل میں انہیں آزماتا ہے ، اور ایسی معلومات کو جو اس کے اپنے مقاصد قرأت اور اس کے مخصوص ذاتی رجحانات سے ہم آہنگ ہوں ، قبول کر لیتا ہے اور غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے ۔

اس طرح قرأت محض عبارت خوانی ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ابلاغ (Process of Communication) ہے جس کی اساس تفہیم اور فکر ہے ۔ اگر یہ عمل ابلاغ ان دونوں سے عاری ہو تو قرأت ایک مردہ جسم بن کر رہ جاتی ہے ۔ ایک مشہور امریکی مفکر ولیم ایس ۔ گرے (William S. Gray) نے قرأت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"قرأت ایک پیچیدہ عمل ہے ۔ اس کے کم از کم چار پہلو ہیں ۔ اول الفاظ کا بصری تصور (Visual Concept) جس میں تلفظ اور معانی دونوں شامل ہوں ، دوم عبارت کی صحیح تفہیم ، جس میں مفہوم

بین السطور (Reading between the lines) مستثنیٰ نہ ہو، سوم عبارت کا استحسان اور اس کی تنقید یعنی عبارت زیر مطالعہ میں مذکورہ خیالات کا جائزہ اور اس سلسلے میں قاری کا ذاتی رد عمل اور چہارم ماخوذ معلومات اور نظریات کا اطلاق۔،،

مندرجہ بالا تعریف خاصی جامع ہے، لیکن عمل قرأت کے ہر پہلو پر عبور حاصل کرنا اور ان سب مہارتوں (Skills) کا اکتساب دس بیس دن میں ممکن نہیں، اس کے لیے سالہا سال کی محنت درکار ہے۔ قرأت کا یہ عمل جس کی ابتدا ماں کی گود سے ہو جاتی ہے، بچے کی جسمانی نشو و نما کی طرح ارتقائی منازل طے کرتا ہوا کمال کو پہنچتا ہے۔ بچے کے سننے کا عمل اور اس کی بول چال کی صلاحیت، اس کی قرأت کی مہارت کے لیے تیاری اور آمادگی (Readiness) کا حکم رکھتی ہے۔ جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو قرأت کا شعور اور پڑھنے کا شوق بھی بڑھنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ عبارت خوانی کی اہلیت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اگرچہ یہ مسلسل اور لامتناہی عمل ہے پھر بھی ہم اسے مختلف ارتقائی مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایسے مرحلے جو بچے کی نشو و نما کے مختلف مدارج سے ہم آہنگ ہوں۔

**قرأت کا پہلا درجہ:** اس کا پہلا درجہ قرأت کی تیاری یا آمادگی (Reading readiness) ہے۔ اس مرحلے میں بچہ پڑھنا نہیں سیکھتا بلکہ پڑھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو ان اوصاف سے غیر شعوری طور پر متصف کرتا ہے جن کی عدم موجودگی میں عبارت خوانی کے فن میں مہارت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً تجربات کی وسعت اور تنوع، بول چال میں مہارت، ذخیرۂ الفاظ میں فراوانی، الفاظ کی مناسب ادائیگی، تربیت چشم کہ وہ ملتی جلتی شکلوں میں امتیاز کر سکے، تربیت گوش کہ وہ ملتی جلتی آوازوں کے فرق کو پہچان سکے، عضویاتی مطابقت بالخصوص آنکھ اور کان میں، جذباتی استحکام (Emotional stability) ذہنی پختگی (Mental maturity) وغیرہ وغیرہ۔

اس ابتدائی تیاری کا دار و مدار بچے کی گھریلو زندگی، اس کے ماحول، اس کی اقتصادی حالت اور وسائل زیست اور مراعات کی فراوانی

یا کمی پر ہوتا ہے ۔ وہ خوش قسمت بچے جو پڑھے لکھے گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں جہاں علم کا چرچا ہو، کتابوں کی کثرت ہو اور پڑھنے کا شوق ہو، جہاں بچے بڑوں کی توجہ کا مرکز ہوں، جہاں ان کے سوالات اور استفسارات قابل توجہ اور موجب التفات سمجھے جاتے ہوں ۔ ایسے ماحول میں پلنے والے بچے پڑھنا سیکھنے کے لیے جلد آمادہ ہو جاتے ہیں، اپنے ان ہم جنسوں کے مقابلے میں جن کے گھر کتابوں سے خالی، علم سے معرا اور افلاس کا مسکن ہوں ۔

ابتدائی تیاری کا یہ درجہ شیر خوارگی سے لیکر مدرسے کی پہلی جماعت تک پہنچتا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ہر بچے میں پڑھنے کا ایک جذبہ بیدار ہو، اور بچے کو یہ معلوم ہو جائے کہ اگر وہ قرأت سیکھ لے تو کتنی مزے دار کہانیاں، کتنے دلچسپ قصے، کس قدر عمدہ گیت، کتنے پر کیف نغمے اور رنگا رنگ کتابیں اور رسالے اس کے اپنے ہو جائیں گے ۔ وہ ایک ایسے جہان معنی سے روشناس ہو جائے گا، جو اب تک محض ان لوگوں کا حق ہے جو پڑھنا جانتے ہیں ۔

قرأت میں آمادگی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ والدین اور اساتذہ بچوں کے لیے ایسے مشاغل کا اہتمام کریں جن سے ان میں پڑھنے کے لیے ایک تڑپ پیدا ہو جائے ۔ ان اقدامات سے بچوں میں اتنا شعور ضرور پیدا ہو جائے گا کہ الفاظ اپنی تحریری صورت میں انہیں معنیٰ کے حامل ہیں، جس طرح عام بول چال کے الفاظ ۔ کتابوں سے کہانی پڑھ کر سنانا، تصویروں کی مدد سے کہانی ترتیب دینا، مصور کتابیں مہیا کرنا، بچے سے کہانی لکھانا اور استاد کا اس کے لیے لکھنا، یہ اور اس قسم کے دوسرے مشاغل تختۂ تحریر پر بچوں میں مطلوبہ شوق اور آمادگی پیدا کرنے میں بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں ۔

جب بچے مدرسے میں آتے ہیں تو ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو پڑھنا سیکھنے کے لیے پورے طور پر آمادہ ہوتے ہیں ۔ لیکن اکثر ایسے ہوتے ہیں جنہیں مزید آمادگی اور مناسب تیاری کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں نہ پڑھنے کا شوق ہوتا ہے نہ جستجو، نہ لگن، نہ اضطراب ۔ یہ بصری امتیاز (Visual discrimination) اور سمعی امتیاز (Auditory

دونوں سے ناآشنا ہوتے ہیں (discrimination) ۔ اس مرحلے پر استاد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے وسیع تجربے ، عمدہ مشاہدے اور فنی سوجھ بوجھ سے ان بچوں کی نشاندھی کرے اور انہیں پڑھنے پر مجبور کرنے کی بجائے ان کے لیے ایسے مشاغل فراہم کرے جو انہیں پڑھنے پر آمادہ کرنے میں مددگار ثابت ہوں ۔

**دوسرا درجہ :** پڑھنے کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں بچہ استاد سے باقاعدہ پڑھنا سیکھتا ہے ۔ مصور قاعدے کی مدد سے ، تختۂ تحریر اور چارٹوں کی مدد سے یا دوسری بصری امدادوں سے جو استاد جماعت میں مہیا کر سکتا ہے ۔ اس وقت اس میں یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ لفظ اور جملوں کی ترتیب دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں جانب جاتی ہے اور اسی طرح پڑھتا ہے یا اوپر سے نیچے کی طرف اقدام کرتا ہے ۔ وہی الفاظ جن سے وہ آشنا ہے ، اب وہ انہیں حروف کی شکل میں پہچاننے لگتا ہے ۔ اس طرح گویا پہلے سے قائم شدہ سمعی تصور کے ساتھ ساتھ اب اس لفظ کا ایک بصری تصور بھی قائم ہو جاتا ہے ۔ بچہ انہی الفاظ کی مدد سے ایک جملہ بناتا ہے اور اس میں ایک معنوی ربط قائم کرتا ہے پھر یہی جملے اس کے لیے ایک مسلسل کہانی بن جاتے ہیں ۔ یہی وہ منزل ہے جہاں استاد تدریسی طریقے کو آزماتا ہے اور جو طریقہ جہاں اور جس طالب علم کے لیے کارگر ہوتا ہے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ، اگرچہ اس درجے میں بلند خوانی (Loud reading) پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ، پھر بھی خاموش مطالعے کو نظرانداز نہیں کیا جاتا ۔ استاد خود نمونے کے طور پر پڑھتا ہے اور الفاظ کے تلفظ اور ہجوں پر مناسب توجہ دیتا ہے ۔ اس سے ایسے الفاظ کے صوتی زیر و بم کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ بآواز بلند یا خاموشی سے ان الفاظ کو اسی طرح دوہراتا ہے ۔

**تیسرا درجہ :** جب بچے کو پڑھنے کی بنیادی مہارتوں میں کافی مشق ہو جاتی ہے تو وہ عبارت کو رواں پڑھنا شروع کر دیتا ہے ۔ از خود نئے نئے الفاظ پڑھنے لگتا ہے ۔ انجانے الفاظ کے تلفظ میں بھی اسے دقت نہیں ہوتی ۔ اپنے درجے کے معیار کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا آسان ہو جاتا ہے اور ان کا مفہوم سمجھنے میں اسے بالکل دشواری

نہیں ہوتی ۔ اس وقت بچہ قرأت کے تیسرے درجے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے پڑھنے کا شوق اور بڑھ جاتا ہے ۔ اسے کہانیوں ، رسالوں اور کتابوں کی تلاش ہوتی ہے ۔ یہی وہ منزل ہے جہاں استاد اپنی فنی صلاحیت اور اپنی قابلیت سے بچے کے ذوق معلومات کا اندازہ لگا کر اس کو معیاری کتابیں مہیا کرتا ہے ۔

معلم کے اس دانش مندانہ اقدام سے جہاں بچے میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی استعداد قرأت میں اضافہ ہونے لگتا ہے ، استاد کی عدم توجہی اور بے تعلقی سے یہی شوق مر جاتا ہے اور پڑھنے کا یہ رجحان کسی اور سمت منتقل ہو جاتا ہے ۔ بعض حالات میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ استاد کی غفلت بچے کو غلط اور غیر موزوں ادب کی راہ پر ڈال دے ۔ اس صورت میں بچہ ایسی چیزیں پڑھتا ہے جن کا اس کی شخصیت پر ناخوشگوار اثر پڑتا ہے ۔ اس کی شخصیت کی تعمیر اور فکر و نظر کی بالیدگی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رسائی عمدہ اور صحت مند ادب تک ہو ۔ کتابیں جاذب نظر ، دل چسپ ، قابل توجہ اور طلباء کے معیار کے عین مطابق ہوں ۔ ہر بچے کو اپنے ذوق کی تسکین کے لیے قرأت کا مناسب جواز مل سکے ۔ اس مرحلے پر خاموش مطالعے کو پہلے کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیے اور استاد کا یہ فرض ہے کہ الفاظ کے تلفظ ، ان کے معنیٰ اور طویل عبارتوں کی تفہیم و تلخیص میں بچوں کی قدم قدم پر رہنمائی کرے ۔

**چوتھا درجہ :** یہ مرحلہ استعداد قرأت کو مزید جلا دینے اور رفتار قرأت میں پختگی پیدا کرنے کا ہے ۔ اس دور میں چوتھی اور پانچویں جماعت کے بچے ایسے الفاظ بھی پڑھتے ہیں جو ان کے صوتی یا سمعی ذخیرۂ الفاظ میں موجود نہیں ۔ نامانوس الفاظ ان کے لیے زیادہ اُلجھنوں کا باعث نہیں ہوتے ۔ بچوں میں پڑھنے کا شوق تیز تر ہو جاتا ہے ۔ اخبارات اور رسائل میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے ۔ ایک عبارت سے مناسب مفہوم اخذ کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے ، قرأت میں آزادی اور خود اعتمادی نمایاں ہو جاتی ہے اور پڑھنے کا عمل بچوں کے لیے خوشگوار فعالیت بن جاتا ہے ۔

اس درجے کے بعد جب طلباء کو مطالعے کے مواقع ملتے ہیں تو ان کا ذوق قرأت اور ابھرتا ہے۔ پڑھنے کی اہلیت بڑھ جاتی ہے اور بچوں میں یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ رفتار قرأت کو مواد قرأت سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انہیں عبارت زیر مطالعہ کا تنقیدی جائزہ لینے، اس کے ادبی محاسن جاننے اور اس کے مطالب کی صحت کے پرکھنے کا فن آ جاتا ہے۔ اب وہ طویل اور گنجلک عبارتوں میں سے معنیٰ کو اس طرح تلاش کر لیتے ہیں جیسے کوئی غواص سمندر کی تہہ سے موتی ڈھونڈھ لاتا ہے۔ انہیں خیالات کے تسلسل پر قدرت ہوتی ہے اور وہ اپنی قرأت کے نتائج کو اس طرح مربوط کرتے ہیں جیسے وہ عبارت کے صوری و معنوی محاسن کی تحسین کا حق ادا کر رہے ہیں۔

---

# قرأت میں بچوں کی سست روی
# اور اس کا علاج

پہلی جماعت میں داخل ہونے والے سب بچے ایک جیسے نہیں ہوتے، کسی میں کوئی صلاحیت کم ہوتی ہے کسی میں کوئی صلاحیت زیادہ۔ وہ اپنے اپنے گھر کی مختلف فضا میں پرورش پاتے ہیں اور مختلف تجربات سے گزر کر ابتدائی مدارس میں آتے ہیں۔ اس لیے استاد کی یکساں توجہ اور مساوی تعلیمی سہولتوں کے باوجود، بچے ترقی کے مدارج اپنی اپنی رفتار اور بساط کے مطابق ہی طے کرتے ہیں۔ پڑھنے ہی کو لیجیے، بچوں کے وہ انفرادی اختلافات جو پہلی جماعت میں نمایاں ہوتے ہیں، اگلی جماعتوں میں پہنچ کر زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے بچوں میں کم و بیش چار درجوں تک کا فرق نظر آنے لگتا ہے۔ پانچویں جماعت میں پڑھنے والے بعض بچے ایسے ہوتے ہیں جو قرأت میں دوسری اور تیسری جماعت کے معیار پر بمشکل پورے اترتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساتویں جماعت کی اردو کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ جب ایک ہی جماعت کے طلباء میں انفرادی اختلافات کا یہ عالم ہو اور ان کے معیار قرأت میں اس قدر تفاوت، تو ظاہر ہے کہ جماعتی تدریس کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ ایک طرف تو وہ پسماندہ (Retarded) طلباء ہیں، جو جماعتی تدریس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور دوسری طرف وہ فطین (Gifted) بچے ہیں، جو قرأت کے میدان میں اس حد تک آگے نکل جاتے ہیں کہ ایک ہی کتاب بار بار پڑھنے سے ان کا شوق قرأت ماند پڑ جاتا ہے اور وہ بور ہونے لگتے ہیں۔ البتہ متوسط درجے کے طلباء ایسی تدریس سے برابر مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

پسماندہ اور فطین طلباء کے مسائل الگ الگ ہیں اور ان کے حل

بھی جدا جدا ۔ زیر نظر مضمون صرف پسماندہ طلباء کی مشکلات قرأت اور ان کے تدارک سے متعلق ہے ۔

قرأت میں پیچھے رہ جانے کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلا سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے ، یہ ہے کہ پسماندہ قاری (Retarded reader) سے کیا مراد ہے ؟ ہماری دانست میں اس سے مراد وہ طالب علم ہے جو قرأت کی جماعتی تدریس اور اپنے درجے کے تمام قرأتی مشاغل (Reading activities) سے کماحقہ استفادہ کرنے سے قاصر ہو۔ ایسے بچے جو مطلوبہ معیار سے ایک درجہ یا ایک سے زیادہ درجے پست ہوں، جن کا ذخیرۂ الفاظ توقع سے زیادہ محدود ، تفہیم خام ، اور رفتار قرأت معیار سے کم ہو— ایسے بچے جو اپنے سے نچلے درجے کی درسی کتابیں بھی کسی دوسرے کی مدد کے بغیر نہ پڑھ سکتے ہوں جنہیں بنیادی قرأتی مہارتوں (Basic reading skills) میں مناسب تربیت اور مشق نہ ہو وہ پسماندہ قاری کہلاتے ہیں ۔

پسماندگی قرأت کی تعریف کے بعد اب ہم اس کے وجوہ کا جائزہ لیتے ہیں اور ان عوامل کا تجزیہ کرتے ہیں جو قرأت کی مہارت کو متاثر کرتے ہیں ۔ وہ عوامل درج ذیل ہیں :

**۱ - جسمانی موانع (Physical handicaps) :**

جسمانی صحت اور قرأت کی مہارت ایک مثبت عددی رشتے (Positive co-efficient of correlation) میں منسلک ہیں ۔ جسمانی لحاظ سے کمزور اور ناتواں بچے جس طرح باقی امور زندگی میں توانا بچوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں ، اسی طرح قرأت کی دوڑ میں بھی ان سے مات کھاتے ہیں ۔ پڑھنے میں توجہ اور انہماک شرط اول ہے اور کمزور اور مریض بچے کتاب پر دیر تک توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے ۔ آئے دن کی علالت کے باعث وہ مدرسے سے رخصت پر رہتے ہیں اور اس طرح قرأت میں پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ پسماندگی قرأت کے ایک تحقیقی جائزے سے ، جو اس قسم کے ہزاروں طلباء پر مشتمل تھا ، یہ پتہ چلا کہ تقریباً پچاس فی صد بچے کسی نہ کسی جسمانی عارضے میں

مبتلا ہیں[1]۔ اسی قسم کے ایک اور جائزے کے مطابق مناسب غذا کی کمی، کسی نہ کسی قسم کی وبائی بیماری اور غدودی اور اعصابی خرابی (Glandular and nervous disorder) ایسے بچوں میں نسبتاً زیادہ تھی[2]۔ لیکن جسمانی عوارض اور قرأت کے اس باھمی تعلق سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ قرأت کی پیش رفت محض جسمانی صحت پر موقوف ہے اور نہ یہ نتیجہ نکالنا بجا ہوگا کہ ہر توانا اور تنو مند بچہ پڑھنے میں تیز اور قرأت میں صحت مند ہوتا ہے۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پڑھنے میں کمزور یا ناکام رہنے والے بچے زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جو کسی جسمانی عارضے میں مبتلا ہوں۔ مثلاً :

(الف) **ضعف بصارت** (Poor vision) : صحت کی عام خرابی کے علاوہ جو جسمانی عارضہ، اعلیٰ قرأت کے حصول میں مانع ہے، وہ ضعف بصارت ہے۔ یوں تو پڑھنے میں بہت سے اعضائے جسمانی سے کام لیا جاتا ہے لیکن عضویات بصارت کو اس عمل میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ بریل ٹائپ (Braille type) کی ایجاد سے قبل نابینا افراد کے لیے پڑھنا ناممکن تھا۔ قرأت میں بہت سی غلطیاں محض نظر کی خرابی کی وجہ سے سرزد ہوتی ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق قرأت میں کمزور رہنے والے پچاس فی صد بچے ضعف بصارت کے مریض تھے اور ان کی قرأت کی اصلاح ان کی نظر کے علاج پر منحصر تھی[3]، لیکن اس قسم کی تحقیقات سے یہ منطقی نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر وہ قاری جس کی بصارت کمزور ہے، پڑھنے میں کمزور ہو گا یا وہ شخص جو قوی البصر ہے، یقیناً اچھا قاری ہو گا۔ البتہ استاد پر یہ لازم ہے کہ وہ پسماندگی قرأت کے مسائل کا تجزیہ کرتے وقت کمزور

---

1. Kottmeyer, William, *Teacher's Guide for Remedial Reading*, Webester Publishing Company, St., Louis, U.S.A., 1955, p. 17.

2. Eames Thomas H., *A Frequency Study of Physical Handicaps in Reading Disability of Unselected Groups.* Journal of Educational Research Vol. 4, April, 1930, pp. 98-101.

3. Kottmeyer, William, op. cit., pp. 17-18.

بچوں کی آنکھوں کا معائنہ ضرور کرائے اور یہ اطمینان کر لے کہ بچے کی کمزور قرأت کا باعث ضعف بصارت تو نہیں ۔

(ب) **ضعف سماعت** (Poor hearing) : حسن قرأت کا دار و مدار حسن سماعت پر ہے ۔ ایک مشہور انگریزی مقولہ ہے "Listen well, read well" یعنی اچھی طرح سنو گے تو اچھی طرح پڑھ سکو گے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سننے میں عدم توجہ یا ثقل سماعت ، پڑھنا سیکھنے اور اس میں کمال حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتا ہے ۔ امریکہ کے ایک مشہور تحقیقی جائزے میں جو ایک ہزار ایسے طلباء پر مشتمل تھا ، جو پڑھنے میں خامیوں کے باعث قرأتی کلینکوں (Reading clinics) میں زیر تعلیم تھے ، اٹھارہ فی صد بچے سماعت کے کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا پائے گئے[4] ۔ اگرچہ یہ شرح بہت اونچی نہیں ، لیکن یہ اس امر کی نشاندھی ضرور کرتی ہے کہ سماعت کی کمزوری بھی قرأت کی کمزوری کا سبب ہو سکتی ہے اور قرأت میں کمزور بچوں کی قوت سامعہ کا امتحان بھی اتنا ھی ضروری ہے جتنا کہ قوت باصرہ کا ۔

(ج) **عوارض تکلم** (Speech defects) : اگرچہ ماہرین تکلم (Speech specialists) کی یہ رائے ہے کہ لکنت ، آوازوں کی صحیح ادائیگی میں دقت پیدا کرتی ہے اور اسی قسم کی دوسری خرابیاں حسن قرأت میں حائل ہوتی ھیں ، لیکن یہ مفروضہ صرف جزوی طور پر درست ہے ، کیونکہ اس کے بعض پہلو ابھی تشنۂ تحقیق ھیں ۔ عوارض تکلم کا قرأت بالجہر (Loud reading) میں حائل ہونا یقینی امر ہے ، لیکن خاموش قرأت (Silent reading) پر اس کا اثر انداز ہونا محل نظر ہے ۔ ھاں یہ بات قرین قیاس ہے کہ تکلم کی کمزوری جذباتی عدم توازن اور ذھنی پیچیدگیوں پر منتج ہو اور یہ چیزیں بچوں کی قرأت کو متاثر کریں ۔ ایک

---

4. Ibid., p. 18.

تحقیقی مطالعے کی رو سے ایسے طلباء کی شرح ، جو تکلم کی کمزوری کی وجہ سے قرأت میں کمزور پائے گئے ، صرف چھ فی صد تھی[5]۔

( د ) **دست و نگاہ کی عدم مطابقت** (Lateral dominance) : اکثر و بیشتر بچے لکھنے میں اپنے دائیں ہاتھ کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں ۔ بعض ایسے بھی ہیں جو بائیں ہاتھ کا استعمال پسند کرتے ہیں ۔ ترجیح کا یہ رجحان محض دست و بازو تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے آنکھیں بھی متاثر ہوتی ہیں ۔ دائیں ہاتھ کو ترجیح دینے والے بچے پڑھتے وقت عموماً اپنی دائیں آنکھ پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور اسی طرح بائیں ہاتھ والے بچے بائیں آنکھ پر۔ لیکن بعض طلباء ایسے بھی ہوتے ہیں جو بائیں ہاتھ کے ساتھ دائیں آنکھ کو اور دائیں ہاتھ کے ساتھ بائیں آنکھ کو استعمال کرنے کا رجحان رکھتے ہیں ۔ چنانچہ الفاظ کا اُلٹ پھیر اور پڑھتے وقت حروف کا آگے پیچھے ہونا اسی مخلوط رجحان کا کرشمہ ہے ، جو ہاتھ اور آنکھ کی عدم مطابقت پر منتج ہوتا ہے ۔ ایک امریکی تحقیقی مطالعے میں اصلاح طلب طلباء میں سے ۳۸ فی صد ایسے مخلوط رجحان کا شکار تھے[6]۔

## ۲ ۔ ذہنی پسماندگی (Intellectual deficiency)

بلا شبہ ذہانت کا قرأت کی کامیابی سے گہرا تعلق ہے اور عام طور پر زیادہ ذہین طلباء پڑھنے میں نسبتاً جلد مہارت حاصل کر لیتے ہیں ، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قرأت میں اصلاح طلب بچے ہمیشہ غبی اور کند ذہن نہیں ہوتے۔ سینٹ لوئیس کی قرأتی علاج گاہوں میں بھیجے جانے والے بچوں میں سے ۷۰ فی صد ایسے تھے جن کا درجۂ ذہانت ۱۰۰ سے کم نہیں تھا[7]۔ بہت سے بچے اپنی ذہانت کے باوجود زبان کی صوتی تفہیم (Phonetic generalization) اور اس کی ساخت و پرداخت میں مہارت حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ تنہا قرأت نہیں کر سکتے ۔

---

5. Ibid., p. 18.
6. Ibid., p. 21.
7. Ibid., p. 19.

پڑھنے میں کمزوری ذہنی آزمائشوں کے نتائج پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ جو بچہ ذہنی آزمائش کے تحریری سوالات کی تفہیم نہیں کر پاتا ، اس سے درست جواب کی توقع رکھنا عبث ہے۔ تجربہ اور تحقیق شاہد ہیں کہ ایسے بچے ذہانت کی زبانی آزمائشوں (Oral tests) میں بہتر نتائج دکھاتے ہیں۔

**۳۔ جذباتی انتشار:**

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جذباتی عدم توازن قرأت میں کمزوری اور ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔ جذباتی آلجھنوں کا شکار بچہ اپنے ہم درس کے ساتھ چلنے سے قاصر رہتا ہے اور جب وہ کلاس میں پیچھے رہتا جاتا ہے تو اپنی ناکامی ، شماتت احباب اور تضحیک طلباء کے باعث احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس سے جذباتی انتشار اور بڑھ جاتا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ انتشار قرأت کی راہ میں سنگ گراں بن جاتا ہے اور بے چارہ بچہ جذباتی پریشانی اور قرأت کی ناکامی کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔ اسے نہ جذباتی سکون نصیب ہوتا ہے اور نہ قرأت میں کامیابی۔ کوپل (Kopel) اور وٹی (Witty) کی تحقیق کے مطابق قرأت میں کمزور رہنے والے کم از کم ۵۰ فی صد بچے خوف اور اضطراب کی آلجھنوں میں مبتلا تھے[8]۔ اسی طرح جنسن (Genson) کے مطالعے کے مطابق ۴۰ فی صد کمزور قاری فساد اعصاب کے مریض (Neurotic) تھے اور ان میں سے اکثر بچوں کے جذباتی مسائل کے ڈانڈے ان کی اپنے اپنے گھروں میں عدم مطابقت (Maladjustment) سے ملے ہوئے تھے[9]۔ گیٹس (Gates) کے مشاہدے کے مطابق ایسے بچے جو قرأت کی چند' در چند مشکلات سے دوچار ہوں ، بالعموم کم آمیز ہوتے ہیں اور ان کی توجہ منتشر رہتی ہے[10]۔

---

8. Witty, Paul and Kopel, D., *Reading and the Education Process*, Ginn & Co. 1939, p. 201.

9. Jenson M.B., *Reading Deficiency as Related to Ceredral Injury and Neurotic Behaviour*, Journal of Applied Psychology, Dec. 1943, p. 535.

10. Gates, A.I., *Failure in Reading and Social Adjustment*, Journal of National Education Association, Vol. 52, 1936.

وہ بے حد حساس ہوتے ہیں ۔ خوف و ہراس، ضد، بزدلی، بات بات پر رو دینا، چلانا، غیر مستقل مزاجی، باہمی لین دین سے کنارہ کشی، جھجک اور تنہائی سے لگاؤ وغیرہ چند ایسی علامات ہیں جو جذباتی مریضوں میں پائی جاتی ہیں ۔ جذباتی انتشار بالعموم خاندانی انتشار اور گھریلو پریشانیوں سے پیدا ہوتا ہے، لیکن خود مدرسہ، اساتذہ کا طرز عمل اور اس ماحول میں کام کرنے والے بعض دوسرے افراد بھی جذباتی مسائل کی تخلیق یا ان میں اضافے اور پیچیدگی کا باعث ہوتے ہیں ۔

بعض محققین کی رائے میں یہ جذباتی مسائل قرأت کی کامیابی میں حائل ہونے کے بجائے اس میں ممد و معاون بھی ہو سکتے ہیں ۔ جذباتی تلخیاں قرأت کے لیے تحریک ذہنی کا موجب بھی ہو سکتی ہیں اور بعض طلباء کی قوت فکر کے لیے چیلنج اور ان کی استعداد قرأت کے لیے تازیانے کا کام کرتی ہیں ۔ چنانچہ وہ جذباتی تلخیوں سے گریز کرتے ہوئے مطالعے کی دنیا میں کھو جانا چاہتے ہیں ۔ مطالعے میں انہیں سکون اور راحت ملتی ہے ۔ طلباء پر جذباتی تلخیوں اور ہیجانات کے اثرات ان کے مزاج کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور ہر طالب علم کا رد عمل اس کی مزاجی کیفیات اور اس کے جذباتی انتشار کی نوعیت کے مطابق مختلف ہوتا ہے ۔ اس طرح استاد پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ پڑھنے میں کمزور بچوں کا معائنہ اور مشاہدہ کرتے وقت ان کے رد عمل اور ان کے جذباتی تاثرات کو بغور دیکھے ۔

**۴ ۔ سماجی عوامل :**

جذباتی انتشار کی طرح معاشری خرابیاں اور سماجی کوتاہیاں بھی طلباء کی قرأت میں کمزوری کا باعث بن سکتی ہیں ۔ ایسا ماحول جس میں ان پڑھ لوگوں کی کثرت ہو، اور ایسے گھرانے جہاں ان پڑھ والدین تعلیم اور قرأت کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہوں، کامیابی کی راہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر حائل ہو جاتے ہیں ۔ ایسے ماں باپ بچوں کو کتابیں اور رسالے خرید کر دینے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور ان کے شوق قرأت کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے ۔ یہی حوصلہ شکنی بچوں میں

ناکامی قرأت کا موجب ہو سکتی ہے ۔ پاکستان میں جہاں خواندگی کا تناسب ۱۵۰۹ فی صد ہے اور جہاں صرف سات فی صد مائیں خواندہ ہیں ، بچوں کو ایسی سہولتیں بہت کم میسر آتی ہیں جو ان کے لیے قرأت میں کامیابی کو سہل بنا دیں ۔ معاشری تفریق اور درجہ بندی (Social stratification) یعنی امیر و غریب ، سرمایہ دار و مزدور وغیرہ کا امتیاز نچلے درجوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی قرأت میں کامیابی پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ ایسے بچوں سے استاد کی بے پروائی اور بچوں کا اپنے افلاس و پستی کو محسوس کرنا مختلف مدارج قرأت پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے ۔ ان کی نظر میں پڑھنے کی وہ اہمیت نہیں ہوتی جو اونچے اور متوسط گھرانوں کے بچے محسوس کرتے ہیں ۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بچوں کی تمام درسی کتابیں اور سواد قرأت اسی ساجی تفاوت اور معاشری تعصبات کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔

رابرٹ ہیوگ ہرسٹ (Robert Havighurst) رقم طراز ہے کہ بچے کے والدین کا اقتصادی و ساجی مرتبہ اس کی قرأت کی کامیابی کے مدارج متعین کرتا ہے ۔ اونچے گھرانے کے بچے جنھیں بہتر خوراک اور رہنے سہنے کی بہتر سہولتیں میسر ہوتی ہیں عام طور پر قرأت میں بہتر نتائج دکھاتے ہیں ۔ ابتدائی تربیت میں ایسے بچوں کو جو ذہنی اور جذباتی تجربات مہیا ہوتے ہیں اور قرأت کی جو مراعات میسر آ جاتی ہیں ، ان سے بچوں کی کامیابی قرأت کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں[11] ۔ امریکہ میں رنگ و نسل کے امتیازات سیاہ فام بچوں کی کامیابی قرأت میں سد راہ ثابت ہوتے ہیں ۔ ایک سے زائد تحقیقی مطالعے اس دریافت کے ضامن ہیں کہ امریکہ میں سفید فام بچوں کی نسبت سیاہ فام بچے قرأت میں زیادہ کمزور ہوتے ہیں ۔ اگر یہ صورت حال صرف ان مدارس تک محدود ہوتی جو محض سیاہ فام بچوں کے لیے مخصوص ہیں تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ بات معیار تدریس کی پستی اور ان اداروں میں مراعات قرأت کی کمیابی کے باعث ہے ، لیکن مخلوط درسگاہوں (De-segregated schools) میں سیاہ فام بچوں کا سفید فام بچوں سے قرأت میں پیچھے رہ جانا اس بات

---

11. Havighurst, R. & Moreira, J.R., *Society and Education in Brazil*, Pittsburgh, University of Pittsburgh Press, 1965, pp. 168-69.

کی دلیل ہے کہ ان بچوں کی ناکامی میں سماجی عوامل اور ان کے احساس کمتری کو دخل ہے ۔ یہی معاشری مسائل بعض دوسرے عوامل کے اشتراک سے بچوں کو بھگوڑا بناتے ہیں اور انہیں طرح طرح کے سماجی جرائم پر آمادہ کرتے ہیں ۔ مدرسے سے بھاگنے اور جرائم کی طرف مائل ہونے کے یہ رجحانات بچوں کی قرأت میں ناکامی کا باعث بنتے ہیں ۔

**۵ ۔ تعلیمی عوامل :**

ہمارے اکثر مدارس میں عمل قرأت ایک غیر دلکش ماحول اور غیر تسلی بخش فضا میں انجام پاتا ہے ۔ اس وقت اردو پڑھنا سکھانے کے جو طریقے رائج ہیں ان میں طلباء کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا ۔ تدریس زبان کے وسائل سے بے اعتنائی اور روائتی طریقۂ تعلیم سے چمٹے رہنا دور اندیشی ، مصلحت اور پیشہ ورانہ بصیرت کے خلاف ہے ۔

اس کے باوجود کہ ابتدائی مدارس پورے تعلیمی ڈھانچے میں اساسی حیثیت کے حامل ہیں ، وہ قابل اساتذہ کی خدمات سے بالعموم محروم رکھے جاتے ہیں ۔ ان مدارس میں مناسب تدریسی اور قرأتی سہولتیں بھی مہیا نہیں کی جاتیں ۔ تصاویر ، توضیحات ، ٹیپ ریکارڈرز اور دیگر سمعی و بصری معاونات کا ذکر ہی کیا ، بعض مدارس تختۂ تحریر تک سے محروم ہیں ۔ پڑھنا سیکھنا اور سکھانے کا دار و مدار صرف ایک قاعدے پر ہے ، جو آتے ہی بچے کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے اور جسے سال بھر میں ازبر کر لینا قرأت کا منتہائے کمال تصور کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ مدرسے میں ایسے بچے بھی نظر آتے ہیں جو ''الف'' سے ''ی'' تک قاعدہ تو سنا سکتے ہیں ، لیکن حروف یا الفاظ کی اچھی طرح شناخت نہیں کر سکتے ۔ یہیں سے قرأت میں کمزوری بلکہ ناکامی کا آغاز ہو جاتا ہے اور جب ایسے بچے اگلی جماعتوں میں ترقی پاتے ہیں تو یہ کمزوری اور ناکامی نمایاں ہوتی جاتی ہے ۔ مواد قرأت کی ضخامت اور بچے کی قوت حافظہ کی نارسائی ، اس پر نااہل ہونے کی چھاپ لگا دیتی ہے اور وہ قرأت کی مشکلات سے گھبرا کر طرح طرح کی غیر سماجی حرکات پر اتر آتا ہے ۔

شہروں کے ابتدائی مدارس کی ہر جماعت میں طلباء کی تعداد اس

قدر زیادہ ہوتی ہے کہ استاد کے لیے انفرادی توجہ دینا محال ہو جاتا ہے بلکہ گروہی تدریس بھی اس کے بس کی بات نہیں رہتی، چنانچہ استاد سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بلالحاظ استعداد و مذاق قرأت، سب ایک کتاب پڑھتے ہیں اور ایک ہی طریقے سے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بچہ اس طرز تدریس سے مستفیض ہو جاتا ہے اس کا سہرا استاد کے سر، اور جو بچہ ناکام رہ جاتا ہے اس کا الزام اس بچے کی عدم صلاحیت پر رکھا جاتا ہے۔

بچوں کی قرأت میں پسماندگی کا ایک اور بڑا سبب انہیں قرأت سکھانے میں عجلت کا رجحان اور آمادگی قرأت (Reading readiness) کے اصولوں کا عدم احترام ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بچے جب تک جسمانی اور ذہنی اعتبار سے پختگی کے ایک خاص درجے تک نہ پہنچ جائیں، وہ قرأتی مہارتوں کو اخذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ہمارے یہاں ابتدائی مدرسے میں داخلے کی کم از کم عمر پانچ برس ہے۔ بڑے شہروں میں اس عمر کے اکثر بچے مدرسے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان مدرسوں میں بچے کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا لحاظ کیے بغیر اس کے دوش ناتواں پر قرأت کا بارگراں ڈال دیا جاتا ہے۔

ماہرین قرأت اس بات پر متفق ہیں کہ سیکھنے کے لیے تقریباً ۷۲ ماہ کی ذہنی عمر شرط اول ہے۔ چونکہ ایک اوسط قابلیت والا چھ برس کا بچہ، ذہنی اعتبار سے بھی چھ برس ہی کا ہوتا ہے، اس لیے اوسط قابلیت کے پانچ سالہ بچوں سے قرأت میں کامیابی کی توقع رکھنا نامناسب ہے۔ ہمارے یہاں نہ تو بچوں کی ذہنی عمر معلوم کرنے کے لیے معیاری آزمائشیں موجود ہیں اور نہ ایسی آزمائشوں سے استفادے کی سہولتیں میسر ہیں۔ اسی طرح ہمارے اکثر اساتذہ آمادگی قرأت کے تصور اور اس کے حصول کے طریق کار سے ناآشنا ہیں۔ ایسی مشقیں جن سے پانچ برس کی عمر کے بچوں میں آمادگی قرأت کو بڑھایا اور چمکایا جا سکے، اردو میں جمع نہیں کی گئیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوازمات کی عدم موجودگی میں استاد کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ بچوں

قدر زیادہ ہوتی ہے کہ استاد کے لیے انفرادی توجہ دینا محال ہو جاتا ہے بلکہ گروہی تدریس بھی اس کے بس کی بات نہیں رہتی، چنانچہ استاد سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنے پر مجبور ہوتا ہے ۔ بلالحاظ استعداد و مذاق قرأت ، سب ایک کتاب پڑھتے ہیں اور ایک ہی طریقے سے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جو بچہ اس طرز تدریس سے مستفیض ہو جاتا ہے اس کا سہرا استاد کے سر ، اور جو بچہ ناکام رہ جاتا ہے اس کا الزام اس بچے کی عدم صلاحیت پر رکھا جاتا ہے ۔

بچوں کی قرأت میں پسماندگی کا ایک اور بڑا سبب انہیں قرأت سکھانے میں عجلت کا رجحان اور آمادگی قرأت (Reading readiness) کے اصولوں کا عدم احترام ہے ۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بچے جب تک جسمانی اور ذہنی اعتبار سے پختگی کے ایک خاص درجے تک نہ پہنچ جائیں ، وہ قرأتی مہارتوں کو اخذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ۔ ہمارے یہاں ابتدائی مدرسے میں داخلے کی کم از کم عمر پانچ برس ہے ۔ بڑے شہروں میں اس عمر کے اکثر بچے مدرسے میں داخل ہو جاتے ہیں ۔ ان مدرسوں میں بچے کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا لحاظ کیے بغیر اس کے دوش ناتواں پر قرأت کا بارگراں ڈال دیا جاتا ہے ۔

ماہرین قرأت اس بات پر متفق ہیں کہ سیکھنے کے لیے تقریباً ۷۲ ماہ کی ذہنی عمر شرط اول ہے ۔ چونکہ ایک اوسط قابلیت والا چھ برس کا بچہ ، ذہنی اعتبار سے بھی چھ برس ہی کا ہوتا ہے ، اس لیے اوسط قابلیت کے پانچ سالہ بچوں سے قرأت میں کامیابی کی توقع رکھنا نامناسب ہے ۔ ہمارے یہاں نہ تو بچوں کی ذہنی عمر معلوم کرنے کے لیے معیاری آزمائشیں موجود ہیں اور نہ ایسی آزمائشوں سے استفادے کی سہولتیں میسر ہیں ۔ اسی طرح ہمارے اکثر اساتذہ آمادگی قرأت کے تصور اور اس کے حصول کے طریق کار سے ناآشنا ہیں ۔ ایسی مشقیں جن سے پانچ برس کی عمر کے بچوں میں آمادگی قرأت کو بڑھایا اور چمکایا جا سکے ، اردو میں جمع نہیں کی گئیں ۔ ظاہر ہے کہ ان لوازمات کی عدم موجودگی میں استاد کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ بچوں

کو قاعدہ پڑھنے پر لگا دے ، لیکن جس طرح بچوں کو قبل از وقت چلنا یا بولنا سکھانے کے نتائج حوصلہ افزا نہیں ہوتے ، بالکل اسی طرح قبل از وقت قرأت میں بھی ناکامی و دل شکستگی کے سوا کچھ ھاتھ نہیں آتا ، بلکہ ابتدائی قرأت کے ناکام تجربات بچوں کو عمل قرأت سے ہمیشہ کے لیے متنفر کر دیتے ھیں -

اس وقت ۶۰ فی صد سے زائد طلباء ابتدائی مدارس کے پانچ درجوں کی تکمیل سے قبل ھی تعلیم کو خدا حافظ کہہ دیتے ھیں اور ان میں کثرت ایسے طلباء کی ھوتی ھے جو پہلی اور دوسری جماعت ھی میں مدرسے سے بھاگ جاتے ھیں - اس طرح اقتصادی و سماجی عوامل کے علاوہ پڑھنے کے روح فرسا اور ناکام تجربات بھی اس صورت حال کے ذمے دار ھیں -

**۶ - لسانی عوامل :**

اردو زبان میں پسماندگی قرأت کی ذمہ داری لسانی عوامل پر بھی عائد ھوتی ھے - مغربی پاکستان میں بہت کم بچے ایسے ھیں جن کی عام بول چال کی زبان اردو ھے یا جن کے گھروں میں اردو بالالتزام بولی جاتی ھے - پشتو، سندھی، بلوچی اور پنجابی بولنے والے بچوں کو اردو سکھانے کے مسائل مادری زبان کی تدریس کے مسائل سے ذرا مختلف ھیں- اس لیے اساتذہ پر لازم ھے کہ اردو کی تدریس میں بچوں کی اردو زبان سے سابقہ واقفیت ، ذخیرہ الفاظ اور اردو بول چال کے تجربات کا جائزہ لیں اور اپنے اس تجربے کی بنیاد پر تدریس قرأت اردو کی عمارت اٹھائیں -

ایسے ابتدائی مدارس میں جہاں اردو کی تدریس کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تدریس بھی شروع ھو جاتی ھے ، اردو کی قرأت کا مسئلہ اور بھی نازک صورت اختیار کر جاتا ھے - وہ بچے جو اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو اور انگریزی ساتھ ساتھ سیکھتے ھیں ، عام طور پر دونوں زبانوں کی قرأت میں کمزور رہ جاتے ھیں اور اردو زبان میں یہ کمزوری بچوں کے عام معیار تحصیل پر بھی اثر انداز ھوتی ھے - مختصر یہ کہ ذولسانیت قرأت کی کمزوری اور پسماندگی کا ایک اھم سبب ھے -

قرأت کی کمزوری کے جن اسباب کا ذکر کیا گیا ، وہ سب کے سب

پڑھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی راہ میں حارج ہو سکتے ہیں۔ ان میں کونسا سبب کس بچے کی ترقی قرأت کی راہ میں مانع ہے، اس کا جائزہ لینا ایک ایسے ماہر قرأت کا کام ہے جو نفسیاتی بصیرت سے متصف ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے بچے ان موانع کے باوجود پڑھنا سیکھنے اور ان رکاوٹوں پر غالب آنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر بچے ان مشکلات سے تنہا نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور یہی بچے اصلاحی قرأت کے ایک ایسے مبسوط پروگرام کے محتاج ہوتے ہیں جو اپنے جلو میں مختلف تدریسی وسائل اور تکنیکی تدابیر رکھتا ہو۔

**تدارک :** قرأت میں کمزوری کے اسباب کا تدارک، ان کی صحت تشخیص پر مبنی ہے جو ایک تجربہ کار اور صاحب بصیرت استاد کے بغیر ممکن نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تشخیص اور اصلاحی قرأت کی سہولتیں قرأتی علاج گاھوں (Reading clinics) میں مہیا ہوتی ہیں، جہاں مختلف آزمائشوں اور سمعی و بصری اعانتوں کے ذریعے طلباء کی تدریسی مشکلات کی تشخیص اور ان کے رفع کرنے کی تدبیر کی جاتی ہے اور جہاں حروف و الفاظ کی شناخت، ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ، تفہیم عبارت اور رفتار قرأت کے جملہ مسائل کو حل کرنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ امریکہ میں ایسے ادارے ہر اچھے مدرسے کا جزو سمجھے جاتے ہیں۔ البتہ جہاں کسی ایک مدرسے میں یہ سہولتیں مہیا کرنا ممکن نہ ہو وہاں شہر کے بہت سے مدارس کے لیے کسی ایک مرکزی درسگاہ میں یہ اہتمام کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایسے ادارے موجود نہیں ہوتے وہاں اصلاحی قرأت کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر جماعت کا استاد اپنے تجربے اور اپنی فنی بصیرت کے ذریعے ایسے بچوں کا مشاہدہ کر کے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ کوئی بچہ پڑھنے میں کیوں کمزور ہے اور اس کمزوری کو کیونکر رفع کیا جا سکتا ہے۔ اگر کمزوری، ضعف بصارت یا ضعف سماعت کے باعث ہو تو بچے کو ماہر امراض چشم یا ماہر امراض گوش کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ آنکھوں کا سرسری معائنہ (Snellen chart) کے ذریعے استاد خود بھی کر

سکتا ہے ۔ اسی طرح آوازوں کے زیر و بم سے ساعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ بچوں کے کردار و افعال اور ان کی روزمرہ کی حرکات و سکنات ، جو کلاس کے اندر یا کمرے کے باہر ان سے سرزد ہوتی ہیں ، بچوں کے جذباتی توازن کی عکاس اور ان کی شخصیت کا پرتو ہوتی ہیں ۔ بچوں کے والدین سے مل کر ان کے معاشری اور خانگی حالات کا پتہ چل سکتا ہے ۔

لسانی اور سماجی عوامل ایسے نہیں جن کا تدارک استاد کے بس میں نہ ہو۔ بچے کے پس منظر سے واقفیت اور اس کے سابقہ تجربات کا علم استاد کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے طریق تعلیم اور وسائل تدریس میں مناسب تبدیلیاں کرکے تدریس قرأت کو زیادہ مفید اور مؤثر بنا سکے ۔

اس وقت تدریس قرأت میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تشخیص قرأت کے لیے معیاری آزمائشیں تیار کی جائیں ۔ اس سے ہماری مراد تشخیصی قرأتی آزمائشوں (Diagnostic reading tests) سے ہے ۔ اسی طرح آمادگی قرأت کا ایک مبسوط لائحۂ عمل اور اس کے لیے ضروری مواد تیار کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس سلسلے میں ہماری توقعات ادارۂ تعلیم و تحقیق ، جامعۂ پنجاب ، لاہور سے وابستہ تھیں ، لیکن افسوس کہ پوری نہ ہو سکیں اور وہاں تاحال اصلاح قرأت کے لیے قرأتی علاج گاہ (Reading clinic) قائم نہیں کی جا سکی۔

قرأت کی خرابیوں کا سدباب کرنے کے لیے پڑھنا سکھانے کے طریقوں میں تبدیلیاں لانا ضروری ہے۔ ہمیں مکتب کے آزمائے ہوئے سابقہ طریقوں کو پھر بروئے کار لانا ہو گا ، یعنی انفرادی تدریس (Individualized instruction) اور گروہی تدریس (Group instruction) کو جماعتی تدریس پر ترجیح دینا ہوگا۔ یہ طریقے ان ابتدائی مدارس میں جہاں طلباء کی تعداد کم ہو ، کامیابی سے آزمائے جا سکتے ہیں ۔ بالخصوص دیہاتوں میں ان کے اطلاق کے امکانات روشن ہیں ۔ تدریس قرأت میں سمعی و بصری معاونات اور میکانکی وسائل کا استعمال بھی بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔ اگر سمعی و بصری امدادوں کے استعمال کی عملی تربیت ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں کے نصاب میں شامل کر دی جائے تو اس سے زیر تربیت اساتذہ کو قرأت کی مشکلات حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

دلچسپ معیاری اور جاذب توجہ مواد قرأت کی کمی اصلاح قرأت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جب تک بچوں کو ایسا مواد مہیا نہ کیا جائے جو ان کی دلچسپیوں کے موافق اور ان کی استعداد قرأت کے مطابق ہو، قرأت کی اصلاح ممکن نہیں۔ اصلاحی قرأت کے نقطۂ نگاہ سے بچوں کے لیے ایسے مواد کی ضرورت ہے جو زبان و بیان کی حیثیت سے آسان ہو، لیکن خیالات و نظریات کے لحاظ سے اس میں بڑی عمر کے ان بچوں کی تسکین کا سامان بھی موجود ہو جو قرأت میں نسبتاً چھوٹے بچوں کے معیار پر ہوتے ہیں۔

بچوں کی جذباتی تہذیب اور رہنمائی کے لیے مدارس میں رہنمائی و مشاورت کا اہتمام بھی نہایت ضروری ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلباء کے بچپن سے لیکر اب تک کے اہم واقعات اور ان کے مشاغل کا ریکارڈ رکھیں۔ ایسے ریکارڈ کی موجودگی میں وہ اپنے اصلاحی اقدامات کو زیادہ مؤثر بنا سکیں گے۔

اصلاح قرأت کی تمام تر ذمہ داری معلم قرأت پر عائد ہوتی ہے اور ایک لائق استاد جو اصلاحی قرأت (Remedial reading) کی تدابیر میں تربیت یافتہ ہو، جو قرأت میں کمزور طلباء کے ساتھ کام کرنے کا حوصلہ اور عزم رکھتا ہو، جو بچوں کی اصلاح کے جذبے سے سرشار ہو، جو بچوں کے مختلف النوع اور ہمہ گیر مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی بصیرت اور اہلیت رکھتا ہو اور جو ہمدرد، مخلص اور محنتی ہو، قرأت کی گتھیوں کو بطریق احسن سلجھا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دوران ملازمت تربیت کے اداروں میں پرانے اساتذہ کو اصلاحی قرأت کی تدابیر میں تربیت دی جائے اور نئے اساتذہ کو موجودہ تربیتی اداروں میں ایسی ہی تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

---

# تدریس شعر

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے

صفی لکھنوی کے اس شعر سے صاف جھلکتا ہے کہ شعر، شعر کہنے والے کے جذبات ملفوظ کا نام ہے یعنی شعر شاعر کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر اچھا شعر کہنے والے کے دل سے نکلتا اور سننے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔

جذبات انسانی کو متعدی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک انسان سے دوسرے انسان اور ایک دل سے دوسرے دل تک آپ سے آپ منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو انتقال جذبات کا یہ عمل کسی لفظ، فقرے یا آواز کا بھی محتاج نہیں ہوتا بلکہ حرکات انسانی، چہرے کی رنگت، ماتھے کے شکن، آنکھوں کی پتلیوں کی گردش اور دیگر تاثرات ان جذبات کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا باعث بنتے ہیں۔ جب ہم خاموش تصاویر سے تاثر قبول کیے بغیر نہیں رہتے تو کلام شاعر جو ایک انسان کے ''دل گداختہ'' کی پکار اور اس کے جذبات قلبی کی واضح للکار ہے، ہمیں متاثر کیے بغیر کیونکر رہ سکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ شعر کو سننے کے بعد سامع پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جو شاعر کے دل پر وارد ہوئی ہے اور وہ شعر، شعر نہیں جو جذبات انسانی کی ترجمانی نہیں کرتا یا ان جذبات کو خاص تاثرات کے تحت تحریک نہیں دیتا۔

**تدریس شعر کے مقاصد:**

تدریس شعر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طالب علم میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ شعر سننے یا پڑھنے کے بعد ان جذبات کو محسوس کرے جن کو شاعر کی حساس طبیعت نے محسوس کرنے کے بعد

شعر کہا ہے ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شعر کا احساس و ادراک یا شعر فہمی ، شعر گوئی کی طرح ایک ذوق و وجدانی چیز ہے اور شعر کو سمجھنے کے لیے طبعی صلاحیت اور خداداد ذوق کی ضرورت ہے ، اور ہر بچے میں شعر کو سمجھنے ، اس کو سراہنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی کم و بیش صلاحیت موجود ہوتی ہے ۔ اگر یہ نہ ہو تو عالم طفولیت میں بچہ جب صحیح معنوں میں زبان نہیں بول سکتا ۔ تال اور سُر پر سر نہ دھنے ۔ بچوں کو کلام موزوں کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ہوتا ہے ۔ وہ وزن کے پیارے ، لے کے عاشق اور جوڑ سے جوڑ ملانے کے مشتاق ہوتے ہیں ۔ گا گا کر پڑھنا ، گانوں کے ریکارڈ سننے کے لیے گراموفون یا ریڈیو کے گرد جمع ہو جانا اور خود گنگناتے رہنا ان کے اس فطری ذوق اور رغبت شعری کا آئینہ دار ہے ۔ استاد کا مقصد شعر فہمی کی طبعی صلاحیت کو اجاگر کرنا ، اس وہبی ذوق کی تربیت کرنا اور اس جذبہ تحسین شعر کو نکھارنا ہے ۔

شعر کسی ایک تاثر اور کسی ایک جذبے کا حامل نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ مختلف تجربوں اور متنوع کیفیتوں کا غماز ہوتا ہے ۔ ایک شعر سے نعرہ مسرت بلند ہوتا ہے تو دوسرے سے غم و الم کی چیخیں نکلتی ہیں ۔ تدریس شعر کا مقصد ہر شعر سے طلباء اور طالبات میں اس مخصوص جذبہ کا احساس پیدا کرنا ہے جس کا وہ مظہر ہے ۔

شاعری کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے بلکہ اسے جملہ فنون لطیفہ میں ایک بزرگ و برتر مقام حاصل ہے کیونکہ ہر فن لطیف کسی ایک احساس کی ترجمانی کرتا اور کسی ایک حس کو اپیل کرتا اور اسے مسرت بخشتا ہے ، جب کہ شاعری بہ یک وقت گوناں گوں احساسات کی نمائندہ بن کر جملہ حواس کو محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ مثلاً موسیقی صرف قوت سامعہ کو مسرور کرتی ہے ۔ مصوری کا تعلق محض بینائی سے ہے لیکن شاعری ایک ہی وقت میں موسیقی و مصوری دونوں کا مزہ عطا کرتی ہے ۔ ایک طرف اس کی دل نواز غنائیت سامع کے کانوں میں میٹھا میٹھا رس گھولتی ہے اور دوسری طرف اس کی محاکاتی کیفیت ذہن کے کینوس پر ایسی لاجواب تصویر کھینچتی

اور اس میں وہ رنگ بھرتی ہے کہ اس کے سامنے مصور کا موقلم بھی عاجز و ششدر رہ جاتا ہے اور ترنم و محاکات کے ساتھ ایک احساس، جذبات میں تموج، طبیعت میں ارتعاش، جملہ حواس کی تسکین کا سامان پیدا کرنا، یہ سب شعر کے سوا کسی اور فن لطیف میں ممکن نہیں۔

تدریس نظم کا بنیادی مقصد یہ تو نہیں کہ طلباء چند الفاظ کے معانی سمجھ لیں یا چند ایک محاورات کا محل استعمال جان لیں بلکہ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہر طالب علم نظم پڑھنے کے بعد ایک پر خلوص ادبی مسرت اور ایک ذہنی کیف محسوس کرے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ شعر کو یوں پڑھائے کہ طلباء اس سے بور نہ ہوں، بلکہ لطف اندوز ہوں۔ وہ شعر کے ترنم کی داد دیں۔ اس کی غنائی کیفیت سے مزہ لیں۔ اس کے وزن کو سمجھیں اس کی تال اور لے کو پرکھیں اور بحیثیت مجموعی اس کے تاثرات سے متاثر ہوں۔ نظم کے اعلیٰ تخیل تک رسائی اور طلباء کے شہباز فکر کو شاعر کی رفعت تخیل تک اڑانا، شاعر کے حسن بیان کی تحسین اور شعر کے دوسرے عناصر مثلاً سلاست، صفائی، حسن بندش، جدت ادا، اور تشبیہہ و استعارہ کے استعمال پر آفرین، یہ بھی تدریس شعر کے مقاصد میں شامل ہیں۔ کسی اخلاقی نظم سے سبق لینا، کسی واقعاتی نظم سے اس واقعہ کے پس منظر کو سمجھنا اور اس کے نتائج سے روشناس ہونا بھی ایک اہم مقصد ہے۔

تدریس شعر سے مدعا یہ بھی ہے کہ طلباء کے اندر ایک ایسا احساس جنم لے جو اس کثیر ادبی سرمایہ کی طرف ان کی راہنمائی کرے جو ہمارے شعراء کی ذہنی کاوش کا نتیجہ اور ان کے دلی جذبات کا مرقع ہے۔ اگر ایک استاد بچے کو شعر کی چاٹ نہیں لگا دیتا، اس میں ایک لگن پیدا نہیں کر دیتا، اس میں شعر سے محبت اور لگاؤ کا جذبہ بیدار نہیں کر پاتا تو وہ استاد تدریس شعر کی اصل غرض و غایت سے کوسوں دور رہتا ہے۔

**اقدامات:**

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جملہ مذکورہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مدرس کو کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیے۔

**انتخاب نظم :**

کسی نظم کو شروع کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ استاد اس کی ہیئت اور اس کے مفہوم و مطالب پر نظر ڈالے اور اس بات کا جائزہ لے کہ آیا یہ نظم اپنے مطالب ، ذخیرۂ الفاظ ، بحر اور ردیف و قافیہ کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے ان مخصوص طلباء کو جو استاد کے مخاطب ہیں ، پڑھایا جائے ۔ یہاں استاد کو طلباء کے رجحانات ، ان کے فطری تقاضوں ، ان کی علمی سطح ، ان کے فکری معیار اور ان کے ذوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی ایسی نظم انتخاب کرنا ہوگی جو ہر پہلو اور ہر اعتبار سے ان کی لیے موزوں ہو اور ان کی زندگی سے ربط رکھتی ہو ۔ پھر نظم کے انتخاب میں موسم اور ماحول کو بھی بہت دخل ہوتا ہے ۔ شدت گرما پر لکھی ہوئی نظم کو موسم سرما میں پڑھانا جبکہ خون انسانی منجمد ہوا جاتا ہو اور سردی کے موضوع پر کہے گئے اشعار کو سخت گرمی کے دن پڑھانا جبکہ تمازت آفتاب سے دماغ کا گودا تک پگھلا جاتا ہو ، نظم کا خون کرنا ہے ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مخصوص کتابوں کے مقرر کر دینے سے استاد کا حق انتخاب ختم ہو جاتا ہے اور معلم مجبور ہوتا ہے کہ وہ تمام نظمیں جو نصاب کی کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں پڑھائے ، لیکن اس میں استاد کو اتنی رعایت تو ضرور ہوتی ہے کہ وہ نظموں کی اس بندھی ٹکی ترتیب میں اپنی جماعت کے طلباء اور موسم و ماحول کی ضروریات کے مطابق ترمیم و تبدیلی کرے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ نصاب کی کتاب منظور کرنے سے پیشتر اس بات کی پوری چھان پھٹک کی جاتی ہے کہ نصاب کی کتابوں میں مشہور نظمیں ، بچوں کے معیار کے مطابق ہوں ۔ ان سے ان کے رجحانات ، ان کے فطری تقاضوں ، ان کے طبعی ذوق اور دیگر حواس کی پوری تسکین کا سامان فراہم ہو ۔ نیز وہ فن شعر کے معیار پر پوری اترتی ہوں اور مقتدر شعراء کی کہی ہوئی ہوں ۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی استاد کسی خاص نظم کو بہت ہی معقول وجوہ کی بناء پر اپنی جماعت کے معیار سے اونچا یا اپنے ماحول سے ٹکراتا ہوا پاتا ہے تو اسے یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ

اس نظم کی بجائے کوئی اور نظم پڑھا دے جس کی تدریس اس کے خیال میں زیادہ ضروری اور مفید ہے۔ معلم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ چھوٹی جماعتوں میں مترنم بحروں والی نظمیں مرغوب ہوتی ہیں اور بڑی جماعتوں میں ترنم کے علاوہ طرز ادا اور ندرت تخیل قابل توجہ ہوتے ہیں۔

**تمہید :**

نظم کے انتخاب کے بعد سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس نظم کو طلباء کے سامنے کس طرح پیش کیا جائے کہ وہ ان کے لیے موجب دلچسپی اور باعث مسرت ہو۔ طلباء کے اذہان اسے بطیب خاطر قبول کریں اور معلم کو نظم کی تدریس کے دوران طلباء کا پورا پورا تعاون حاصل رہے۔ اصطلاح میں اس اقدام کو ''تحریک ذہنی'' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ نظم کی تدریس سے قبل استاد کے لیے لازم ہے کہ وہ نظم پڑھنے ، شعر سمجھنے اور اس کی داد دینے کے لیے ایک خوشگوار ماحول اور موضوع سے مطابقت رکھنے والی ساز گار فضا مہیا کرے کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو نظم کے سبق کی کامیابی محال ہے۔ معلم کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی دلچسپ اور موزوں گفتگو سے ، اپنے سلیقہ مندانہ برتاؤ سے اور اپنی نفسیاتی اور علمی سوجھ بوجھ سے نظم کے موضوع سے ملتی جلتی باتیں کرے۔ ایسی باتیں جن کا ایک سرا طلباء کی سابقہ معلومات سے ملتا ہو تو دوسرا اس نظم کے موضوع و مطالب میں کھلتا ہو۔ مثلاً استاد کو محروم کی لکھی ہوئی نظم ''ملکہ نورجہاں کا مزار'' پڑھانا ہے۔ طلباء نورجہاں ایسی تاریخی شخصیت سے نابلد نہیں ہیں۔ وہ ملکہ نورجہاں کی عظمت ، اس کی فراست ، اس کے حسن ، حکومت کے نظم و نسق میں اس کے عمل دخل اور جہانگیر کی زندگی میں اسے جو بلند مقام حاصل رہا اس سے واقف ہیں۔ لیکن یہ باتیں ان کے حافظہ' بعید یا بعض طلباء کے حافظہ' قریب میں ہیں۔ اب ان ساری باتوں کو گفتگو کا موضوع بنانا ، مناسب سوالات کے ذریعے نورجہاں کے بارے میں یہ سارا مواد حاصل کرنا ، پھر کمال اور زوال کا تعلق اور اس دنیا کی بے ثباتی کو واضح کرنا اور اس بارے میں

طلباء کے تاثرات معلوم کرنا اور اس کے بعد اس نظم کو پڑھانا یقیناً زیادہ موزوں ہے ۔ بجائے اس کے کہ استاد جماعت میں جائے اور نظم کا متن پڑھاتا جائے اور اس کا مفہوم بیان کرتا جائے جبکہ طلباء کے دماغ کہیں کے کہیں گھوم رہے ہوں ۔ اس نظم کو شروع کرنے کے لیے لاہور کے اساتذہ کو تو اور بھی موزوں مواد ہاتھ آ جاتا ہے کہ اکثر طلباء نے نورجہاں کا موجودہ مزار دیکھ رکھا ہے اور معلم کو مزار پر براہ راست گفتگو کرنے اور فوراً اصل موضوع کی طرف گریز کرنے میں سہولت رہتی ہے ۔ نورجہاں کے مزار کی تصویر یا اس کے ماڈل اور نورجہاں اور جہانگیر کی تصاویر دکھانے سے سبق میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اس طرح نورجہاں ، جہانگیر اور ان کے مزاروں کے دھندلے نقوش ، نکھر کر پورے رنگ ، روپ کے ساتھ ان کے سامنے آ جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغوں سے پراگندگی کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور اذہان میں سبق اور صرف سبق کے متعلق خیالات جمع ہو جاتے ہیں ۔ سبق کے آغاز میں شاعر کی تصویر دکھانے ، اس کے حالات زندگی اور اس کے کلام پر مختصر گفتگو کرنے سے طلباء کے دلوں میں شاعر کی عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور شاعر سے محبت اور لگاؤ کا یہ جذبہ ، نظم پڑھنے اور اس کو سراہنے میں ممد و معاون بنتا ہے ۔ چکبست کی منظوم رامائن کا وہ ٹکڑا جہاں رام چندر جی بن باس کو سدھارتے وقت ماں سے رخصت ہونے جاتے ہیں ۔ پڑھانے سے پیشتر ایک خاص فضا تیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ بچے ماں کی مامتا کو سمجھتے ہیں اور اس کی محبت و شفقت کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قول و اقرار ، ایفائے عہد کی اہمیت ، باپ کی عزت اور اس کے حکم کا پاس اور ایثار و قربانی یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا دھندلا سا خاکہ طلباء کے ذہن میں موجود رہتا ہے ۔ اب ان سب حقائق کے بارے میں ان کے تاثرات کو اگلوانا اور پھر اس اخذ کردہ مواد سے ایک محل تعمیر کرنا جس کے جھروکوں میں بیٹھ کر وہ اس سماں کو ملاحظہ کریں جس کی منظر کشی شاعر نے کی ہے ، معلم کی فن کاری اور اس کی سلیقہ شعاری کا متقاضی ہے ۔ علی ھذالقیاس ''آمد صبح'' کے موضوع پر انیس کے اشعار پڑھانے سے

قبل اگر بچوں کے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے فائدہ اٹھا کر صبح کے سہانے سماں، طلوع آفتاب کے حسین نظارے، پرندوں کی چہک، کلیوں کی مہک، سرسبز گھاس اور اس پر بکھرے ہوئے شبنم کے قطرے کہ جن کو سورج کی سنہری کرنیں موتی بنا کر چمکاتی ہیں وغیرہ کے بارے میں خاصی گفتگو کر لی جائے اور پھر دوسرے شعراء کے چند اچھے اچھے شعر جو اسی موضوع پر کہے گئے ہوں سنا دیے جائیں تو سبق کی اٹھان آسان اور نظم کی تفہیم سہل تر ہو جائے گی۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں، عدل جہانگیری، سیر کہسار، ایک آرزو، جوگی، غرض جتنی نظمیں ان کی مناسبت سے اتنی جدا جدا تمہیدیں۔

تاریخی واقعات والی نظموں کی تمہید میں استاد کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تاریخ کو ہمیشہ ثانوی حیثیت حاصل رہے۔ یعنی سبق دیکھ کر یہ احساس پیدا نہ ہو کہ یہ سبق اردو ادب کا سبق نہیں بلکہ تاریخ کا سبق ہے۔ تاریخی واقعہ پر روشنی ڈالنا بجا، تاریخی شخصیتوں سے ان کی تصاویر اور چارٹ دکھا کر تعارف کرانا درست۔ لیکن اس طرح کہ تاریخ ادب پر غالب نہ آنے پائے۔

اخلاقی نظموں میں اخلاق کی متعلقہ شق پر مناسب لیکن مختصر بحث سبق کی کامیابی کا راستہ ہموار کر دیتی ہے۔ غزلیات میں جہاں ہر شعر ایک الگ تجربے کا حامل ہو اور معلم کو کوئی ایسا موضوع ہاتھ نہ آئے جسے موضوع تمہید بنایا جا سکتا ہو، وہاں شاعر کے تذکرے اور اس کے فن اور شاعری پر گفتگو کرکے بچوں کے ذہنوں کو نئے سبق کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔

**تصاویر کا استعمال :**

تمہیدی گفتگو کو دل آویز بنانے اور تدریس کو دلچسپ بنانے کے لیے موزوں تصاویر اور نقشہ جات سے مدد لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ ''جوگی'' کی نظم پڑھاتے وقت اگر معلم ایک ایسے جوگی کی تصویر جو ایک لمبا سا چوغہ نما کرتہ پہنے ہوئے، ایک ہاتھ میں عصائے

فقیری اور دوسرے میں کشکول تھامے ہوئے، لٹیں لٹکائے پاؤں میں کھڑاواں، گلے میں موٹی موٹی مالا اور پھٹے ہوئے کانوں میں بڑے بڑے مندرے پہنے ہوئے دکھا دے تو سبق میں خود بخود دلچسپی بڑھ جائے گی۔ پہاڑ کے ایسے مناظر کی خوش رنگ تصاویر جنہیں شاعر نے لفظی تصویروں میں بیان کیا ہے نظم کی تدریس کو اس قدر جاذب توجہ بنا دیں گی کہ بیان ممکن نہیں۔ اسی طرح ''ایک آرزو'' کو پڑھاتے وقت ایک ایسی تصویر جس میں ع

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

اور جہاں

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ایسی تصویر جس میں ع

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی

اور جہاں غروب آفتاب کا دل فریب منظر پیش کیا گیا ہو۔ پہاڑ کے ایک کونہ میں اس چشمے کے کنارے ایک کٹیا ہو اور علامہ اقبال سبزے کے بچھونے پر ہاتھ کا سرہانا بنائے ہر فکر سے آزاد لیٹے نظر آئیں۔ یقیناً جماعت ہفتم کے بچوں کے لیے ایک عجیب فرحت اور دلچسپی کا سامان مہیا کرے گی۔

**تمہید میں احتیاط کی ضرورت :**

ماحول کی تیاری میں استاد کو اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی گفتگو لمبے چوڑے لیکچر پر مشتمل ہونے کی بجائے آسان اور مختصر بات چیت پر موقوف ہو جس میں طلباء برابر کے شریک ہوں۔ استاد کی حیثیت عامل اور بچے کی کیفیت معمول کی نہ ہو، بلکہ معلم متعلمین کے پورے تعاون سے تمہید کی استوار بنیادوں پر سبق کی عمارت کھڑی کرے۔ جس میں استاد کے موزوں سوالات اور طلباء کے مناسب جوابات خام مواد اور مسالے کے طور پر استعمال ہوں۔ تمہید میں بے جا طوالت سبق کا ناس کر دیتی ہے ۔

معلم کے ہاں وقت کے تناسب کا احساس پایا جانا بھی نہایت ضروری ہے اور جو مدرس اس احساس سے عاری ہوتا ہے۔ وہ کبھی سبق کو کامیابی کی منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس لیے کہ اول تو وہ ماحول کی تیاری میں ادھر آدھر بھٹک کر بہت سا وقت ضائع کر دیتا ہے اور تحریک ذہنی کی بجائے وہ طلباء کے دل و دماغ کو دور از کار باتوں سے اور زیادہ پراگندہ اور منتشر کر دیتا ہے اور اگر وہ تحریک ذہنی میں کامیاب بھی ہو جائے تو وہ بچوں کی اس آمادگی اور ذہنی تیاری سے فائدہ نہیں آٹھا سکتا کہ منزل اول ہی میں وہ اتنا وقت لے جاتا ہے کہ دوسرے اقدامات ادھورے اور تشنہ رہ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلے سے سوچی ہوئی تمہیدی گفتگو اور پہلے سے سوچے سمجھے سوالات استاد کے لیے خاصے مفید ہوتے ہیں۔ اس لیے موقع بے موقع سوال پوچھتے رہنا جہاں تضیع اوقات کا موجب ہوتا ہے وہاں بعض سوالات بے معنی، بعض بچوں کے فہم و ادراک سے بالا اور بعض بے ڈھب اور غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ جملہ سوالات کا دار و مدار بچوں کی سابقہ واقفیت پر ہونا چاہیے۔ سوالات ایسے ہوں جو نئے سبق کی طرف بڑھنے میں مدد دیں۔ سوالات فکر انگیز ہوں، البتہ زبان ان کی سادہ رہے۔ سوالات سے طلباء کی جبلت استعجاب چمک آٹھے اور طلباء نئے سبق کے لیے نہ صرف آمادہ بلکہ بے تاب ہو جائیں۔

تربیتی اداروں میں اسباق مباحثہ میں اکثر تمہیدیں اپنی بے ربطی کے باعث کھٹکا کرتی ہیں اور بعض تو اچھی خاصی مضحکہ خیز ہوتی ہیں اور طلباء اور ناقدین دونوں کے لیے سرمایۂ تمسخر فراہم کرتی ہیں۔ اگر خوف طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو تفنن طبع کے لیے دو چار مثالیں یہاں نقل کر دی جاتیں۔

**موضوع سے تعارف :**

تدریس شعر میں ماحول کی تیاری کے بعد یہ ضروری ہے کہ بچوں کو اصل موضوع سے متعارف کرایا جائے اور مختصراً نظم زیر مطالعہ کی اہمیت اور اردو ادب میں اس کے مقام پر روشنی ڈالی جائے۔ شاعر

کا تذکرہ اگر تمہید میں نہ ہوا ہو تو یہاں ہونا چاہیے۔ ہاں! اگر اس شاعر کی کوئی نظم بچوں نے پہلے سے پڑھ رکھی ہے اور طلباء اس شاعر کی شخصیت اور شاعرانہ کمالات سے بخوبی واقف ہیں اور اس شاعر کے بارے میں مزید کچھ بتانا معیار سے اونچا اڑنا ہے تو پھر انہی بتائی ہوئی باتوں کا اعادہ کر لینا کافی ہوگا۔

**قرأت :**

اب نظم خوانی کی باری آتی ہے۔ یہ حصہ فی الحقیقت سبق کی جان کا حکم رکھتا ہے۔ نظم کا سبق عبارت ہے اس کی اچھی قرأت سے، قرأت اچھی تو نظم اچھی ورنہ بڑھیا نظم بھی قرأت کے گھٹیا پن کے بھینٹ چڑھ گئی۔ سبق کی کامیابی کا سارا مدار استاد کے اپنے نمونہ قرأت پر ہے۔ استاد کا انداز نظم خوانی نہایت مؤثر اور دل کش ہونا چاہیے۔ اس کی آواز موضوع نظم کے مطابق آتار چڑھاؤ کے فن سے آشنا ہو، غم میں آواز کا ڈوب جانا، دکھ کے بیان میں دل کا بیٹھنا اور جی کا چھوٹ جانا، ایک فطری امر ہے۔ لب و لہجہ اور آواز سے مترشح ہونا چاہیے کہ داستان غم پڑھتے ہوئے معلم کا دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ آواز بھرا رہی ہے۔ آنکھوں میں غم کی رمق اس کی غم بھری آواز کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس کے برعکس اگر نظم میں فرحت و انبساط کی باتیں ہیں، خوشی اور مسرت کے ترانے ہیں، محبت کے مد بھرے گیت ہیں تو استاد کی آواز میں ایک مستی، ایک سرور اور کیف ہونا چاہیے۔ اگر نظم شجاعت اور دلیری کا قصہ بیان کرتی ہے، قوم کو جہاد کی دعوت دیتی ہے، جذبات میں جرأت اور جوش پیدا کرتی ہے اور انسان کو مردانگی اور بہادری کا درس دیتی ہے تو معلم کی آواز میں مردانہ وقار، ایک خطیبانہ جوش، ولولہ اور زور کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ یہ نہ ہو تو قلوب میں گرمی اور جذبات میں جولانی کہاں سے آئے گی اور نظم سے خاطر خواہ تاثر کیوں کر پیدا ہوگا؟ جذبات، آواز اور حرکات کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ درست ہے کہ کبھی صرف آواز اور کبھی صرف حرکات ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ لیکن اگر یہ دونوں موجود ہوں تو انتقال جذبات کا عمل نہ صرف

سہل ہو جاتا ہے بلکہ زیادہ پر اثر اور زیادہ واضح بھی۔ اس لیے معلم کو چاہیے کہ وہ آواز کے زیر و بم اور تغیرلحن کے ساتھ ساتھ بغرض ضرورت حرکات و سکنات کا بھی خیال رکھے ورنہ سبق کا بنیادی مقصد کہ طلباء ان جذبات سے متاثر ہوں جن سے متاثر ہو کر خود شاعر نے شعر کہے ہیں، فوت ہو جائے گا۔ استاد کی آواز میں ایک جادو ہونا چاہیے۔ وہ جادو نہیں جو ایک موسیقار اور مغنی کی آواز میں ہوتا ہے بلکہ وہ کشش اور وہ اثر جو ایک خطیب اور جادو بیان مقرر کی آواز میں ہوتا ہے۔ آواز بلاشبہ ذوق کی طرح ایک فطری اور وہبی چیز ہے۔ لیکن اس کی تربیت اسی طرح ممکن ہے جس طرح جمالیاتی ذوق کی۔ لب و لہجہ کو سنوارنا، اس میں اتار چڑھاؤ پیدا کرنا اور نظم کے جذبات کو اپنے آپ پر وارد کرکے خلوص کے ساتھ اسے آواز کا روپ دینا بہت حد تک استاد کے بس کی بات ہے اور جو استاد اس بارے میں محنت اور ریاضت سے کام لیتے ہیں، عروس مقصد سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

**خلوص :**

قرأت میں اصل چیز قاری کا خلوص ہے۔ خود شعر جس کی تدریس کی ذمہ داری معلم اپنے سر لیتا ہے، شاعر کے خلوص کا مظہر ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال

برگ گل رنگین ز مضمون من است مصرعہ من قطرہ خون من است

شعر شاعر کے دل سے نکلتا ہے اور اس کا ہر مصرعہ اس کے خون جگر سے رنگینی حاصل کرتا ہے۔ ایسے شعر اور نظم کی قرأت کا حق کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔ اگر اس میں قاری اپنے خلوص کا رس نہ گھولے اور اس پہ اپنے خون جگر کی آب نہ چڑھائے، اسی مضمون کو علامہ اقبال اپنے مخصوص پیرائے میں اور اچھوتے انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں

آیا کہاں سے نغمہ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے یا چوب نے
جس روز دل کے رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

اور پھر ع     خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

اور ع     نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

کہہ کر علامہ نے اس بات کو دو آتشہ کر دیا ہے یا یوں کہیے کہ قند مکرر کا مزہ آنے لگا ہے۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ ہر نظم کو گا کر پڑھنا درست نہیں اور اگرچہ اس دور میں بعض گائی ہوئی نظموں کے ریکارڈ جماعت میں لگانا یا ریڈیو سے سنوانا بجا ہے لیکن عام حالات میں یہی بہتر ہے کہ معلم نظم کو تحت اللفظ پڑھتے ہوئے اپنے اخلاص اور فن کے رچاؤ سے وہ بات پیدا کرے کہ طلباء کے دلوں کی دھڑکنیں استاد کی آواز اور اس کی حرکات و سکنات کا ساتھ دیں۔ طربیہ نظم میں ان کے دل خوشی سے جھوم جائیں اور چہرے پھول کی طرح کھلکھلا اٹھیں۔ المیہ میں وہ مجسمہ غم نظر آئیں اور پژمردگی کے اثرات ان پر غالب ہوں۔

نظم کی قرأت میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ معلم وزن کا خیال نہ رکھتے ہوئے کسی غلط جگہ پر زور دے کر شعر کا خون کر دیتے ہیں۔ تاکید کا خیال نہیں رکھتے۔ تلفظ غلط ہونے کی وجہ سے شعر کے ترنم کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ مؤثر قرأت کے لیے ضروری ہے کہ تفصیل، تاکید، تلفظ، روانی وغیرہ کا پورا خیال رکھا جائے۔

وحدت تاثر کو قائم رکھنے کے لیے چھوٹی نظمیں عام طور پر پوری کی پوری پڑھی جاتی ہیں۔ البتہ لمبی نظموں کے لیے ضروری ہے کہ ان کا ایک ایک بند یا دو تین مربوط بندوں کو جن کو جدا کرنے سے مطلب فوت ہو جاتا ہو، اکٹھا پڑھا جائے۔ نظم یوں پڑھنی چاہیے کہ طلباء کو نظم سنتے ہوئے اسے سمجھنے میں سہولت ہو اور استاد کی قرأت کے بعد وہ اس کی نقل کر سکیں۔ بعض اوقات نظم کی ایک قرأت کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کے تاثر کو بڑھانے اور اس کی تفہیم کو سہل بنانے کے لیے معلم کو دو مرتبہ نظم پڑھنا پڑتی ہے۔ معلم کو دوبارہ پڑھنے سے کترانا نہیں چاہیے۔ نظم کی بحر کا خیال رکھنا بھی

ضروری ہے ۔ چھوٹی بحر میں غزلیں عام طور پر شدت تاثر کے اعتبار سے نشتر کی سی آبداری اور چبھن رکھتی ہیں ۔ لمبی بحریں عموماً مترنم ہوتی ہیں اور ایک سماں باندھتی ہیں ۔ دونوں کی قرأت میں استاد کو ایک الگ الگ انداز اپنانا ہوگا ۔

استاد کے نمونہ قرأت کے بعد طلباء کی باری آتی ہے ۔ چھوٹے بچے بالخصوص اور بڑے طلباء بالعموم استاد کی نقل آتارنے کے شائق بلکہ مشّاق بھی ہوتے ہیں ۔ معلم کو چاہیے کہ ان کے اس فطری ملکہ سے فائدہ آٹھاتے ہوئے انہیں اسی انداز، اسی آواز اور اسی رکھ رکھاؤ سے پڑھنے کی ہدایت کرے جس کا اس نے خود نمونہ دیتے وقت التزام کیا تھا ۔ اگر بچہ نظم کو رواں دواں پڑھ رہا ہے اور پڑھتے پڑھتے کوئی غلطی کر جاتا ہے تو اسے ٹوکنے کی بجائے اصلاح کو مؤخر وقت پر آٹھا رکھنا چاہیے ۔ یعنی غلطی کی تصحیح اس وقت ہو، جب بچہ قرأت ختم کر لے ۔ دوران قرأت ٹوکنے میں روانی پر ضرب کاری لگتی ہے ۔ ہاں جہاں طالب علم پڑھتے پڑھتے بالکل رک جائے اور بغیر امداد کے آگے بڑھنے سے قاصر ہو وہاں استاد کو لقمہ دینے یا تصحیح کرنے سے گھبرانا نہیں چاہیے ۔ بعض محتاط ماہرین تعلیم کا خیال تو یہ ہے کہ معلم اپنے نمونہ قرأت کے بعد اور بچوں کی نظم خوانی سے قبل، ایسے مشکل الفاظ کا تلفظ، جن کے غلط ہونے کا امکان ہو، وضاحت سے بتا دے ، بلکہ ان کی اجتماعی مشق کروائے ۔ معلم اپنے نمونہ قرأت کے بعد اگر کسی اچھے طالب علم سے پڑھوائے تو بدرجہا بہتر ہے ۔ اس لیے کہ اس طرح طلباء کو بیک وقت دو بہتر نمونے میسر آ جاتے ہیں ، اور کمزور طلباء کے لیے اس کے بعد پڑھنا اور آسان ہو جاتا ہے ۔ لیکن کمزور طلباء کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی روا نہیں ۔ در اصل یہ معاملہ کہ کس سے پہلے پڑھوانا ہے اور کس سے بعد میں خالص داخلی معاملہ ہے اور ہر استاد کو کلی اختیار ہے کہ وہ اپنے جماعت کے حالات کا جائزہ لے کر مناسب اقدام کرے ۔

**تفہیم شعر :**

قرأت شعر کے بعد تفہیم شعر کا نمبر ہے ۔ بعض اساتذہ تو یہ غلطی

کرتے ہیں کہ خود پڑھتے جاتے ہیں۔ مشکل الفاظ کے معانی بتاتے جاتے ہیں ۔ شعر کا مطلب بھی خود ہی بیان کر دیتے ہیں ارر یوں ساری نظم ختم ہو جاتی ہے ۔ اشعار کی وضاحت میں ود پورا زور بیان صرف کرتے ہیں۔ لیکن طلباء کے پلے بہت کم پڑتا ہے ۔ یہ طریقۂ تعلیم کالج کی جماعتوں میں درست سہی ، لیکن مدارس میں بے کار اور نقصان دہ ہے ۔ دوسرا طریقہ جو اکثر دیکھنے میں آیا ہے ۔ وہ یہ کہ لڑکے سے شعر پڑھوا لیا اور مطلب خود بیان کر دیا ۔ اس طرح بھی طالب علم کی حیثیت تقریباً خاموش سامع کی سی ہوتی ہے ۔ سبق کی کامیابی اور طلباء کا فائدہ ان کے عملی اشتراک اور ذاتی تعاون پر موقوف ہے ۔ استاد کی حیثیت ''بازاری خلاصہ'' اور ''شرح'' کی نہیں ہے کہ ہر لفظ کے معنی اور ہر شعر کی تشریح اس کی طرف سے ہو۔ معلم کی حیثیت ایک راہبر اور راہنما کی ہے ۔ اس کا کام معانی بتانا نہیں بلکہ معانی کا راستہ دکھانا ہے ۔ اس کا فرض شعر کی تشریح کرنا نہیں بلکہ شعر کی تشریح کرانا ہے ۔ وہ مطلب بتانے کے لیے نہیں ، مفہوم اخذ کرانے کے لیے ہے ۔ موزوں سوالات کے ذریعے شعر کے مفہوم تک پہنچانا استاد کا کام اور اس سے آگے طلباء کا فرض ۔ بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ استاد کو سب کچھ خود ہی بتانا پڑتا ہے ۔ لیکن یہ صورت حال جس قدر کم پیش آئے بہتر ہے ۔ مشکل الفاظ و محاورات ، اگر جملوں میں استعمال کے ذریعے طلباء کے سامنے پیش کیے جائیں تو طلباء خود بخود ان کے معانی سمجھ جاتے ہیں ۔ نظم میں اکثر تراکیب کی دقت پیش آتی ہے ۔ معلم کو چاہیے کہ وہ ان مرکبات کا تجزیہ کرائے اور پھر معانی اخذ کرائے ۔ مثلاً نسیم سحر ، تبسم گل ، خرام صبا ، ویرانی دشت ، فلک نیلگوں ، شادابی چمن وغیرہ کا تجزیہ کر دیا جائے تو مطلب خود بخود واضح ہو جاتا ہے ۔ بچہ جو معنی خود اپنی کوشش سے دریافت کرکے استاد کو بتاتا ہے ، اس میں وہ دوگونہ مسرت محسوس کرتا ہے اور یہ خود تلاش کردہ معنی اسے دیر تک یاد رہتے ہیں ۔

**تشبیہات و استعارات :**

شعراء جب کسی حسین چیز کے حسن کو دوبالا کرنا چاہتے

ہیں یا کسی بد زیب اور کریہہ منظر شے کو اور زیادہ گھناؤنا بنا کر پیش کرنے کے درپے ہوتے ہیں تو تشبیہہ اور استعارہ کا سہارا لیتے ہیں۔ کسی مرئی چیز سے تشبیہہ دی جائے تو غیر مرئی چیز بھی تصویر بن کر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ تشبیہہ جذبہ کی شدت کو بڑھاتی، تاثیر کو تیز تر کرتی اور اشیاء کو ایک نیا روپ دیتی ہے۔

انیس کا یہ مشہور شعر:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

یا میر کے یہ اشعار:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے    دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
ہستی اپنی حباب کی سی ہے    یہ نمائش سراب کی سی ہے

تشبیہہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔ تشبیہہ کے موزوں اور خوبصورت استعمال سے کلام کے تاثر اور شعر کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ تشبیہات کی وضاحت نہایت ضروری ہے تاکہ طلباء کے ذوق کی صحیح تربیت ہو سکے، اور ان کا مذاق شعر جلا پائے۔ پھر سادہ اور پیچ دار تشبیہہ میں فرق واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ تشبیہہ جہاں شعر کا زیور ہے وہاں اس کا عیب بھی بن سکتی ہے۔ بعض اوقات شعر میں تلمیحات بھی ملتی ہیں۔ جب تک ان کی وضاحت نہ ہو شعر کا مطلب واضح نہیں ہوتا مثلاً

کشتی مسکین و جان پاک و دیوار یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اس ایک شعر کی تشریح میں پورا قصۂ سفر موسیٰ و خضر علیہما الصلوٰۃ و السلام بیان نہ ہو تو لفظی مطلب سے کیا پلے پڑے گا؟

**اشعار کی تشریح:**

بعض حضرات شعر کی تشریح کے سرے ہی سے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں شعر ایک نازک آبگینہ ہے جو کسی تشریح کا متحمل

نہیں ہو سکتا ۔ اس سے انکار نہیں کہ شعر کی مثال ایک نازک آبگینے کی ہے ۔ لیکن جب تک شعر کا تجزیہ کرکے اس کی خوبیوں کو ابھارا نہ جائے، صحیح استحسان کا جذبہ کیسے پیدا ہوگا اور طلباء کے ذوق شعر کی تربیت کیونکر ہوگی۔ یہ درست ہے کہ بلا ضرورت شعر کے حصے بخرے کرنے اور سہل شعروں کو خواہ مخواہ طویل تشریحات کا جامہ پہنانا بے کار ہے۔ کیونکہ ضرورت سے زیادہ پوسٹ مارٹم واقعی شعر کے مزے کو کرکرا کر دیتا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ الفاظ و محاورات کی تفہیم اور شعر کی تشریح تابع ہونی چاہیے، احساسات و جذبات کے ۔ محض لفظی مطالب سے شعر کی خوبی واضح نہیں ہو سکتی۔ ضروری ہے کہ استاد طلباء کو شاعر کی فکر کی بلندی تک اڑنا سکھائے ۔ اگر طلباء کی پرواز، شاعر کی حد پرواز کو چھو لے تو سمجھیے کہ استاد اپنے سبق میں سو فیصد کامیاب رہا ۔

تشریح میں استاد کو لیکچر کی بجائے تشریحی اور سوالیہ طریقہ اپنانا چاہیے تاکہ طلباء کو خود سوچنے اور الفاظ کے سمندر میں غوطہ لگا کر معانی کے موتی نکالنے کا موقع ہاتھ آتا رہے ۔ ایک ایک شعر کی تشریح کے بعد پورے بند اور پھر پوری نظم کا مجموعی مفہوم اخذ کرا لینا چاہیے تاکہ نظم میں موجود وحدت تاثر ضائع نہ ہو ۔ غزل جس کا ہر شعر ایک الگ تجربے اور ایک جدا جذبے اور نئے خیال کا حامل ہو، اس اصول سے مستثنیٰ ہوگی۔ نظم کا خلاصہ کرانا اور اس کے مرکزی نقطۂ خیال کا کھوج لگانا یا اس میں پوشیدہ اخلاقی سبق کی وضاحت وہ ضروری اقدامات ہیں جن کے بغیر سبق نامکمل رہتا ہے ۔

**استحسان :**

تدریس شعر میں استحسان کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ۔ استحسان کا آغاز یوں تو نظم خوانی کے ساتھ ساتھ ہو جاتا ہے ۔ جوں جوں استاد اور طلباء شعر پڑھتے جاتے ہیں اس کے ترنم، اس کی غنائیت، اس کے وزن اور اس کی بندش سے لطف اٹھاتے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ استحسان کسی حد تک سطحی اور ظاہری ہوتا ہے ۔ اس سے طلباء یہ تو سمجھ جاتے

ہیں کہ بحر مترنم ہے لیکن نفس مضمون کی تحسین، زبان، الفاظ اور تراکیب کی تحسین، اسلوب اور انداز کی تحسین، تشبیہات اور استعارات کی تحسین اسی وقت ذہن میں آتی ہے جب طلباء پر تفہیم اشعار کی منزل آسان ہو گئی ہو اور وہ شاعر کے جذبات کا تجزیہ کر چکے ہوں۔

استحسان سے مراد بچوں کے ذوق تنقید کو بروئے کار لانا، ان کی پرکھ کی قوت کو تحریک دینا اور ان کے مذاق شعر کو نکھارنا ہے۔ استحسان کی اقدار طلباء کے معیار کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ جس درجہ کا طالب علم ہوگا، اسی درجہ کا اس کا ذوق شعر ہوگا، اور اسی درجہ کا جذبہ استحسان اور شعور تنقید۔ ثانوی مدارس کی فوقانی جماعتوں کے طلباء سے تو ہمیں یہ امید ضرور رکھنا چاہیے کہ وہ نصاب کی مشمولہ نظموں کے اسلوب سے واقف ہوں۔ وہ یہ جانتے ہوں کہ فلاں شاعر کس صنف شعر میں مہارت رکھتا ہے اور اس خاص صنف کے شعراء میں اس کا کیا مقام ہے۔ اس کے انداز میں تکلف اور آورد ہے یا سادگی اور آمد۔ وہ زیادہ مترنم بحروں کا دلدادہ ہے یا کم مترنم بحروں کا۔ اسے لمبی بحر سے دلچسپی ہے یا چھوٹی بحر سے۔ کسی خاص نظم میں الفاظ کے انتخاب میں وہ دِقت پسندی کے رجحان کا اظہار کرتا ہے یا سہل پسندی کا۔ وہ عام طور پر مشکل اور ناہموار زمین میں طبع آزمائی کرتا ہے یا آسان اور ہموار زمین میں۔ اسے ذخیرۂ الفاظ پر کہاں تک قدرت حاصل ہے۔ اس کی بحر اور اس کے الفاظ، صوتی اور معنوی اعتبار سے اس کے خیالات اور جذبات سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔ یعنی شاعر نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے جو لفظ چنے ہیں وہ اپنی آواز اور معانی کے اعتبار سے کہاں تک اس کیفیت کو پیدا کرتے ہیں جو شاعر کے پیش نظر ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال کی ایک نظم ''دریائے نیکر کے کنارے ایک شام'' لیجیے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی     شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش     کہسار کے سبز پوش خاموش

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے　　آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا سماں ہے　　یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا　　قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خموش ہو جا　　آغوش میں غم کو لے کے سو جا

مندرجہ بالا اشعار میں الفاظ ایسے لائے گئے ہیں جو نہ صرف معنوی اعتبار سے خاموشی کے آئینہ دار ہیں بلکہ آواز کے لحاظ سے بھی شاعر کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مثلاً ش اور س کی تکرار صوتی اعتبار سے خاموشی اور سکوت کا سماں پیدا کر رہی ہے۔ خاموش، شاخیں، شجر، نوا فروش، کہسار، سبزہ پوش، بے ہوش، آغوش شب، ایسے الفاظ کا استعمال اور پھر لفظ خاموش کا تکرار ایک خاص سکوت کی کیفیت کا عکاس ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" الفاظ کی صوتی اور معنوی ہم آہنگی کی وجہ سے جو تاثر پیدا کرتی اور غم کا جو سماں باندھتی ہے، وہ شاعر کے ذوق انتخاب الفاظ کی عمدہ مثال ہے۔

کسی رزمیہ مثنوی میں ہلکے پھلکے، نرم و شیریں الفاظ کا انتخاب نامناسب ہوتا ہے اور اسی طرح بزمیہ مثنوی یا غزل میں بھاری بھرکم، پر جلال اور شکوہ دار الفاظ زیب نہیں دیتے۔ اسی لیے بعض شاعر جو بزم نگاری میں بہت کامیاب ہوتے ہیں، رزم نگاری میں ناکام رہتے ہیں اور رزمیہ کہنے والے شاعر بزم کے میدان میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ فی الحقیقت شعر کی ہر صنف کا ایک خاص مزاج ہے، قصیدے کا مزاج الگ ہے اور غزل کا مزاج الگ ہے اور ہر صنف شاعری میں بحر، الفاظ، حتیٰ کہ خیالات تک کے انتخاب میں اس کے مزاج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

یہ دیکھنا کہ شاعر کا تخیل کس قدر بلند ہے اور اس کی شعری تخلیق ہماری زندگی کے تجربات سے کتنی قریب یا دور ہے۔ اس نے اپنی نظم میں اپنے ماحول اور معاشرے کی کہاں تک ترجمانی کی ہے۔ اس نے انسانیت کو کیا سبق دیا ہے۔ اخلاق کے کن پہلوؤں پر روشنی

ڈالی ہے ۔ محبت کے کن لطیف جذبات کی عکاسی کی ہے ۔ شاعر نے مختلف مناظر کو کس انداز سے دیکھا ہے اور ان کی تصویر کشی میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے ۔ مختلف انسانوں کے جذبات سمجھنے اور پھر ان جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں اس نے کس فن کاری کا ثبوت دیا ہے ۔ ان سب چیزوں کا تھوڑا بہت جائزہ لینا ضروری ہے ۔ لیکن یہ سب کچھ بالتدریج ہوگا ۔ ایک ہی نظم میں یہ ساری باتیں سمونا ممکن نہیں ۔ معلم کو چاہیے کہ وہ منزل استحسان کو ہر سبق میں نگاہ میں رکھے اور رفتہ رفتہ ان کے ذوق تنقید کی تربیت کرتا چلا جائے ۔

**قرأت ثانی :**

تفہیم اشعار اور استحسانی سوالات کے بعد پوری نظم کو دوبارہ پڑھنے یا پڑھوانے سے طلباء کے دل و دماغ مجموعی حیثیت سے نظم کی ہیئت اور اس کے مضمون کے بارے میں وہ تاثر قبول کرتے ہیں جس کے تحت خود شاعر نے وہ نظم کہی ۔ پہلی مرتبہ جب انہوں نے نظم پڑھی یا سنی تو انہوں نے محض سطحی حظ اٹھایا ، کیونکہ ہنوز وہ شعر کے مفہوم سے ناآشنا تھے ۔ اب جبکہ وہ نظم یا غزل کے ایک ایک شعر کو سمجھتے ، اس کی فنی خوبیوں پر نگاہ رکھتے اور شاعر کے کمال شعری سے کچھ واقف ہو چکے ہیں تو نظم کی قرأت شراب دو آتشہ کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اب جو طلباء سر دھنتے ہیں اور ہونٹ چاٹتے ہیں تو ان کے مزے میں سطحیت نہیں بلکہ حقیقت اور گہرائی ہوتی ہے ۔

**اعادہ :**

یہ جائزہ لینے کے لیے کہ طلباء نے کیا سمجھا اور کس کس طالب علم نے نظم کو پوری توجہ سے پڑھا ، معلم کو نظم پر مجموعی حیثیت سے کچھ سوالات کرنے چاہئیں ۔ یوں تو اس کے پورے سبق میں سوالات کا ایک جال بچھا ہوتا ہے اور معلّم طلباء کو ہوشیار اور متوجہ رکھنے کے لیے ہر چیز خواہ معانی ہوں یا تشریح سوالات ہی کی مدد

سے اخذ کراتا ہے ۔ لیکن اس اقدام کا خصوصی مقصد ہی یہ ہے کہ پڑھے ہوئے سبق کی تمام باتوں کو دو چار منٹوں میں اس طرح دھرا لیا جائے کہ طلباء کے اذہان پر اس کا ایک مجموعی تاثر ثبت ہو جائے ۔ سبق کے مختلف حصوں اور اس کی مختلف کڑیوں میں اگر کچھ فرق رہ گیا ہے تو اس فاصلے کو پاٹ کر ان کو یکجان اور مربوط کر دیا جائے اور ساتھ ساتھ طلباء کے حافظہ قریب کا امتحان کر لیا جائے کہ اعادہ سے یہی چیزیں دیرپا اور ذہن نشین ہو جاتی ہیں ۔ اعادہ میں نظم کا خلاصہ کسی خاص شعر کی تشریح ، کسی تلمیح کا پس منظر ، کسی تشبیہہ کی وضاحت ، کسی واقعہ یا منظر وغیرہ کا حال پوچھا جا سکتا ہے ۔

اصولاً جہاں سبق کی تمام منازل پر بحث ختم ہوتی ہے وہاں ہمارا مضمون بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ استاد کو نظم پڑھانے کے بعد بچوں کو شعر یاد کرنے کی ترغیب دینی چاہیے اور انہیں جماعت میں بھی اس کام کے لیے وقت دینا چاہیے ۔ انہیں بتایا جائے کہ شعر سے گفتگو میں رنگینی اور تقریر میں زور کیونکر پیدا ہو جاتا ہے ۔ شعر کے استعمال سے خط میں جاذبیت اور تحریر میں حسن نظر آنے لگتا ہے ۔ انہیں پوری نظم یا کوئی خاص شعر یاد کرنے پر بھی مجبور نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کام اور اشعار کے انتخاب کو طلباء کے اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی اہلیت پر چھوڑ دینا چاہیے ۔ شعر سے فطری لگاؤ رکھنے والے بچے سینکڑوں اچھے شعر یاد کر لیتے ہیں ۔ حالانکہ بعض دوسرے بچے دس بیس شعر بھی مشکل ہی سے یاد کرتے ہیں ۔ معلم کا کام رہنمائی کرنا اور رغبت دلانا ہے نہ کہ جبر و تشدد ۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ بچوں کے ذوق ، ان کی پسند اور ان کے رجحانات کو دبائے نہیں بلکہ ان کا مناسب احترام کرے ۔ انہیں اپنے تاثرات بیان کرنے اور اپنے خیالات کے اظہار میں پوری آزادی ہونی چاہیے ۔

———

# اردو رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ

ماہرین لسانیات نے السنۂ عالم کو مختلف خاندانوں اور گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ایک گروہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں دوسرے قبیلے کی زبانوں سے اپنی ہیئت ترکیب اور ساخت کے اعتبار سے اس قدر مختلف ہیں کہ بظاہر یہ یقین نہیں آتا کہ یہ سب زبانیں کبھی ایک ہی منبع سے نکلیں اور یہ سارے سوتے ایک ہی سرچشمے سے پھوٹے۔

جب انسان عالم وجود میں آیا تو قوت گویائی اور زبان ساتھ لایا۔ ''علم آدم الاسماء کلھا'' اور ''علمہ البیان'' کی مقدس آیات قرآنی اسی حقیقت کا اعلان ہیں۔ انسان سے انسان کی نسل چلی اور زبان سے زبان کی۔ انسان دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گیا۔ اس کے توسل سے اس کی زبان بھی مختلف گوشوں اور کونوں میں جا پہنچی۔ ہر خطے کی مخصوص فضا تھی۔ مختلف آب و ہوا تھی۔ نئے حالات تھے اور نئے تقاضے۔ نئی مصیبتیں اور نئی ضرورتیں—ان سب چیزوں نے اس کی وضع قطع، اس کے لباس اور اس کے طرز بود و ماند پر اثر کیا۔ زبان ان اثرات سے کیونکر بچ سکتی تھی۔ چنانچہ دنیا میں جتنے خطے، جتنے ملک اور جتنے علاقے بنے اتنی زبانیں وجود میں آئیں۔ پھر جب مختلف علاقوں کے لوگوں میں میل جول شروع ہوا تو تہذیبوں کے تصادم سے نئی تہذیبیں پیدا ہوئیں اور زبانوں کے ملاپ سے نئی زبانیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا کہ پرانی زبانیں مردہ ہو کر رہ گئیں اور ان کی گدی نئی زبانوں نے سنبھال لی۔

جوں جوں انسان نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی کی، رہن سہن کے طریقوں کو سنوارا، تہذیب و تمدن کو نکھارا، توں توں اس

کی زبان سنورتی اور نکھرتی چلی گئی۔ پھر ایک دور آیا کہ اس نے لکھنے کا فن ایجاد کیا۔ اپنی زبان کے مختلف اسماء کے لیے مختلف تصویری علامات وضع کر لی گئیں۔ طبیعت ناصبور تھی۔ اس پر قناعت نہ ہوئی۔ قدم آگے بڑھایا۔ تصویری علامات کو اس قدر جامع بنا دیا کہ یہ مسلسل اور مربوط عبارات کے لیے کارآمد ہو گیا۔ جب یہ تصویری رسم الخط انسان کی روز افزوں ضروریات کا ساتھ نہ دے سکا تو آوازوں پر مبنی علامات وضع کی گئیں۔ یعنی مختلف آوازوں کو مختلف علامتوں میں ظاہر کیا جانے لگا اور ہوتے ہوتے مکمل رسم الخط کی صورت پیدا ہو گئی۔ آج دنیا میں بیسیوں رسم الخط ہیں۔ زبانوں کے ماخذ کی طرح ان کا ماخذ بھی ایک ہی ہے۔ بدلی ہوئی صورتوں کے باوجود ابجد (ABCD)، کلمن (KLMN) اور قرشت (QRST) میں صوتی ہم آہنگی اور پھر ان کی ترتیب اس بات کی غماز ہے کہ مختلف خطوں کے دھارے ایک ہی چشمے سے پھوٹے۔ لیکن بعد کی ترامیم اور تغیرات نے ان کے ڈھانچے بدل دیے۔ زبانوں کے میل جول کے ساتھ ساتھ خطوں کا ملاپ بھی جاری رہا۔ کبھی کسی زبان نے اپنے خط کے لیے دوسری زبان کے خط کو اپنا لیا اور کبھی اس کے اتباع میں اپنے خط میں چند ایک ضروری تبدیلیاں کر لیں۔

موجودہ فارسی اور اس کے رسم الخط ھی کو لیجیے۔ جب عربی اور پہلوی کا میل جول ھوا تو اس اختلاط نے ایک ایسی زبان کو جنم دیا جو پہلوی سے بہت مختلف ہو گئی۔ جب زبان وہ نہ رہی تو رسم الخط کہاں تک ساتھ دیتا۔ اس لیے مجبوراً پہلوی کے مشکل اور مبہم رسم الخط کے بجائے عربی رسم الخط کو کچھ اضافوں اور ترامیم کے ساتھ اپنا لیا گیا۔

لاطینی کو دیکھیے۔ یہ زبان روم کے ایک قبیلہ لاطین کی ایک بولی تھی۔ سلطنت روما کے عروج کے زمانے میں ملک ملک میں پھیلی۔ جہاں پہنچی وہاں کی بولی کو متاثر کیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے قالب میں ڈھال لیا۔ آج دنیا کی بیسیوں زبانوں میں اس کے حروف اور الفاظ ہیں اور بیسیوں اس کے رسم الخط میں لکھی جاتی ھیں۔

عربی اور لاطینی کے علاوہ ایک تیسرا اہم خط دیو ناگری ہے۔

جو سنسکرت کے قدیم رسم الخط کی اصلاح شدہ صورت ہے اور ہندوستان کی اکثر بولیوں اور زبانوں کے کام آیا۔ اردو جو فارسی اور برصغیر پاک و ہند کی مقامی بولیوں کے ملاپ سے ظہور میں آئی۔ ناگری رسم الخط کے سانچے میں نہ ڈھل سکی کہ مزاج پر فارسی کی گہری چھاپ تھی۔ چونکہ ہندی نژاد تھی اس لیے ناگری سے بے اعتنائی بھی ممکن نہ تھی۔ لہذا اعتدال پسندی سے کام لیتے ہوئے کچھ علامات فارسی سے لیں، کچھ عربی سے اور کچھ ہندی آوازوں کو اپنی علامات میں ڈھالا اور یوں اپنے فنکارانہ برتاؤ اور سلیقہ مندی سے ایسا خط وضع کر لیا جو اس کے اپنے مزاج کے عین موافق اور اپنی ضروریات کے عین مطابق تھا۔

اس تمہیدی گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ زبان کی تاریخ اور لسانیات کی دنیا میں یہ ایجاب و قبول کوئی نئی چیز نہیں۔ ایک ایک رسم الخط مناسب اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ دس دس بیس زبانوں کے لیے رائج ہوا لیکن اس طرح کہ نئی زبان میں پہنچ کر وہ اسی کا ہو گیا۔ سامری خط سنسکرت میں آیا تو اور کا اور ہو گیا۔ یہی سنسکرت جو پالی کے لیے استعمال ہوا تو اس کی شکل پہلے سے مختلف ہو گئی۔ پھر جب پالی کو برج بھاشا کے لیے اپنایا گیا تو اس میں اور اضافے کر لیے گئے۔ رسم الخط کی جڑیں اور بنیادیں یقیناً ایک رہیں لیکن شاخیں اور پتے وضع قطع کے اعتبار سے مختلف ہو گئے اور اس پیوند سے پھلوں کا مزہ بھی یکسر بدل گیا۔

رسم الخط میں اصلاح و ترمیم کا حق ہر دور میں حاصل رہا اور آج بھی کسی زبان کے ماہروں اور اس کے لکھنے پڑھنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر ان کا رائج الوقت رسم الخط بڑھتے ہوئے تقاضوں اور نت نئی ضروریات کا ساتھ دینے سے قاصر ہو تو اس کی مناسب اصلاح کریں۔ دوسرے رائج رسم الخطوں سے استفادہ کرتے ہوئے اسے ایک معیاری رسم الخط کا مقام عطا کریں۔ لہذا اگر کسی طرف سے یہ تجویز پیش ہو کہ فلاں رسم الخط چونکہ اپنی ہیئت ترکیبی اور رنگ ڈھنگ کے اعتبار سے ناقص ہے اور اس حد تک ناقص ہے کہ اس کی اصلاح ہی

ممکن نہیں اور زبان کی سلامتی کا راز اس سے نجات اور فلاں رسم الخط کے اپنانے میں مضمر ہے تو اس سے جھنجھلانے کا کوئی مقام نہیں۔ لیکن چونکہ رسم الخط کی تبدیلی زبان میں ایک عظیم انقلاب کی پیامبر ہوتی ہے اور ایک شدید تغیر کی ضامن ہوا کرتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اس تبدیلی سے زبان ایک ایسی نئی دنیا میں قدم رکھتی ہے جہاں کے قاعدے جدا، اصول نئے اور اطوار نرالے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ یہ ساری تبدیلیاں اس بیماری کے مزاج کو کہاں تک راس آئیں گی۔ کہیں نئی فضا کی گھٹن میں یہ اپنا دم تو نہیں توڑ بیٹھے گی۔ کیا یہ زندگی بھر کا نیا ساتھ نبھ سکے گا۔ کیا یہ ہوا اس کے من اور تن کی دنیا میں بہار لا سکے گی۔ کیا اس انتقال مکانی سے وہ ساری بیماریاں جاتی رہیں گی جو ہمارے لسانی نباضوں نے تشخیص کیں۔ کیا یہ نیا دارو اس کے سارے دکھوں کا مداوا بن سکے گا جو دور حاضر کے حکیموں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ پھر ایسے انقلاب آفرین علاج کو قبولنے سے پہلے تشخیص کے بارے میں ایک بار نہیں دس بار اطمینان کر لینا چاہیے۔ تشخیص ہی غلط ہوئی تو دوا بجائے فائدہ پہنچانے کے اُلٹا نقصان کرے گی۔ تشخیص کے بعد نسخہ لکھتے اور دوا تجویز کرتے وقت مریض کے مزاج کو پیش نظر رکھنا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔

اب ان ساری باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اس مرض کا جائزہ لیتے ہیں جو ہمارے بعض اطباء کے خیال میں اردو زبان کے قالب کو کھائے جا رہا ہے اور اس کی جسمانی نشو و نما کی راہ میں روک بنا ہوا ہے اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مجوزہ علاج اس کے مزاج کے پیش نظر اس کے لیے کہاں تک مفید ہے۔

رسم الخط کا یہ ''روگ'' جس کا کھوج لگایا جا چکا ہے آج سے پچاس سال پہلے بھی موجود تھا۔ مہاتما گاندھی اس زبان سے اسی لیے ناراض تھے کہ یہ قرآن کے حروف یعنی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور چاہتے یہ تھے کہ فارسی اور عربی کے الفاظ چھانٹ دیے جائیں اور اسے ناگری کا لباس اوڑھا دیا جائے۔ یہ تجویز رد کر دینے

دور انگریزوں کے اقتدار کا
کے قابل تھی اس لیے رد کر دی گئی۔ یہی
دور تھا۔ انگریزی ہندوستانیوں کے رگ و پے میں بس چکی تھی۔
اذہان نے انگریزی کے تسلط کو قبول کر لیا تھا۔ اردو ادب پر انگریزی
ادب کا رنگ چڑھنے لگا تھا۔ زبان انگریزی الفاظ و محاورات کو اپنے
آغوش محبت میں غیر شعوری طور پر سمیٹے چلی جا رہی تھی۔ جب
ناگری پسند نہ آیا تو یار لوگوں نے لاطینی رسم الخط کر آگے بڑھایا۔
چونکہ دلدادگان زبان اور پرستاران اردو نے اسے بھی زبان کی فلاح و بہبود
کے منافی سمجھا اس لیے اسے بھی ٹھکرا دیا گیا۔

آزادی کا سورج نکلا۔ غلامی کے گھناؤنے بادل چھٹ گئے۔
تاریکی نور میں بدل گئی۔ اردو کا پھریرا لہرانے لگا۔ کبھی کبھی
مشرق سے تیز ہوائیں چلیں۔ مغرب سے آندھیاں بھی اٹھیں۔ شمال و
جنوب سے اپنے اپنے موسم میں تیز طوفانی لہریں یلغار کرتی رہیں۔
لیکن یہ علم جو اس سے قبل ہندوستان کی باد سموم کے سامنے خم
نہ ہوا تھا، ان کے آگے سرنگوں کیونکر نہ ہوتا؟ قائد اعظم کی دعائیں
اس کے ساتھ تھیں۔ ان کا نعرۂ حق اس کے لیے آب حیات تھا۔ یہ اسی
آن بان سے ہوا میں لہراتا رہا۔ اس دور میں محبوں اور مخلصوں نے
اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کوششیں شروع کیں۔ زمانے کو آگے بڑھا
اور زبان کو پیچھے رہا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ علوم و فنون اور
ادب دونوں میں اسے آگے بڑھانا چاہا لیکن طباعت کی مشکلات کو راستے
میں حائل پایا۔ کاتب کا لکھنا۔ پلیٹ پر اتارنا۔ اس ''آتار چڑھاؤ''
میں حروف کا مٹ جانا۔ پھر انہیں درست کرنا۔ داب میں پھر ان کا مٹنا
پھر ٹھیک کرنا اور پھر دو چار ہزار دابوں کے بعد دم توڑ دینا۔ یہ ساری
باتیں راستہ روکنے لگیں۔ طباعت کی ان مشکلات کا حل سوچا جانے
لگا۔ کسی نے کہا اس کا واحد حل ''نسخ'' ہے۔ دوسرے نے کہا
نہیں اس کا علاج ''لاطینی'' ہے۔ تاحال یہ بحث چل رہی ہے۔ دونوں
اس کے بہی خواہ، دونوں اس کے ہمدرد، تشخیص تو ہو لی کہ لیتھو کی
موجودگی میں ہمارا پریس اور ہماری زبان ترقی نہیں کر سکتے اور
ہزاروں کی تعداد میں لٹریچر فراہم نہیں ہو سکتا۔ لیکن علاج میں

اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ لاطینی کے حامیوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے
کہ اس کے اپنانے سے نہ صرف

۱ ۔ طباعت کی مشکلات سے چھٹکارا ہو جائے گا ، بلکہ

۲ ۔ رومن رسم الخط سے پڑھنا اور لکھنا بھی سہل ہو جائے گا۔ ہمارے بالغ اور بچے اسے جلد جلد سیکھ لیں گے کیونکہ اس خط میں حروف ہر حال میں اپنی انفرادی شکلیں برقرار رکھتے ہیں یعنی حرف الگ الگ لکھے جاتے ہیں اور حروف کی تعداد بھی کم ہے۔ اس طرح ملک میں خواندگی کا بول بالا ہو جائے گا اور جہالت نابود ہو جائے گی۔

۳ ۔ اس خط کو اگر اردو اور بنگلہ دونوں کے لیے اپنا لیا گیا تو ایک نئی قومی زبان ظہور میں آ سکے گی جو ملکی استحکام کی ضامن اور حقیقی وحدت و اتحاد کی ذمہ دار ہوگی۔

۴ ۔ اس خط کو اختیار کر لینے کے بعد طلباء کا دوسری زبانیں سیکھنے کا کام بھی بہت آسان ہو جائے گا۔

۵ ۔ ہماری زبان اس سانچے میں ڈھل کر جدید مغربی زبانوں کی ہم پلہ ہو جائے گی اور یوں دنیائے مغرب میں اس کا وقار بلند اور نام اونچا ہو جائے گا۔

۶ ۔ اہل مغرب اور دوسرے غیر ملکی حضرات کو ہماری زبان سیکھنا آسان ہو جائے گی۔

آئیے ان دلائل کی صحت کو بڑی غیر جانب داری سے پرکھیں اور ان پر بے لاگ تنقید کے بعد یہ دیکھیں کہ اردو کی بہبود کس رسم الخط میں مضمر ہے؟ رومن میں یا نسخ میں اور ان دونوں میں سے کون سا خط اس کے مزاج کے راس ہے؟

اگر بات طباعت تک ہی محدود رہتی تو لاطینی رسم الخط کے رد میں صرف ایک ہی دلیل کافی تھی کہ جب موجودہ اردو رسم الخط میں نستعلیق کے علاوہ نسخ کی بھی ایک صورت موجود ہے اور اس کے اپنا لینے سے آوازوں اور تلفظ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اور طباعت

کی دشواریاں بھی جاتی رہتی ہیں تو لاطینی کی کیا ضرورت ؟ عربی اور فارسی میں نسخ نہایت کامیابی سے چل رہا ہے ۔ بڑے بڑے ضخیم روزنامے ہزاروں کی تعداد میں اسی خط میں چھاپے جاتے ہیں ۔ خود پاکستان میں بہت سی کتابیں اور رسائل اسی خط میں چھپ رہے ہیں ۔ اگر اس کا معیاری ٹائپ رائٹر تا حال نہیں بن سکا اور موجودہ ٹائپ رائٹروں میں کچھ تکنیکی خامیاں موجود ہیں تو وہ رفع ہو سکتی ہیں ۔ چیزوں کی ایجاد میں صدیاں لگتی ہیں لیکن جب کوئی ایجاد معرض وجود میں آ جاتی ہے تو اس کی نوک پلک درست کرنے اور اسے معیاری بنانے میں چند سالوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔

''نسخ مہنگا ہے اور رومن سستا''۔ اول تو یہ بات کوائف اکٹھے کیے بغیر ہی کہی جا سکتی ہے ۔ یہ بھی ٹائپ اور وہ بھی ٹائپ ، نسخ میں اگر ٹکڑوں کی زیادتی کی وجہ سے قالب ساز (Compositor) کو رومن کی نسبت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور وہ زیادہ معاوضہ مانگتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ آخر رومن کے ایک صفحے کا مواد بھی تو نسخ کے نصف صفحے میں آ جاتا ہے ۔ رومن میں حروف الگ الگ لکھے جاتے ہیں ۔ نسخ ایک طرح کی مختصر نویسی ہے ۔ اس لیے کاغذ کے مصارف میں بچت ہو جاتی ہے ۔ قالب ساز کا وقت اگر ضرورت سے زیادہ صرف ہوتا ہے تو اس کی وجہ مشق کی کمی اور ناتجربہ کاری ہے ۔ ایک مشاق قالب ساز اسی سہولت سے نسخ کی عبارات کا ڈھانچہ تیار کر سکتا ہے جس آسانی سے رومن کا ۔ یہ کہنا کہ لوگوں کو نسخ پڑھنے میں دقت ہوتی ہے صحیح نہیں ۔ نستعلیق میں چھپی ہوئی کتابیں پڑھنے والا انسان معمولی مشق سے یہ کتابیں بآسانی پڑھ سکتا ہے ۔ نسخ کے بتدریج نفاذ سے یہ دقت آپ سے آپ رفع ہو جائے گی اور اگر نسخ میں پڑھنا مشکل ہوگا تو رومن میں پڑھنا تو اور بھی مشکل ہوگا ۔

اسی طرح یہ رائے کہ نسخ خوبصورت خط نہیں ، محل نظر ہے ۔ ایک مشہور کہاوت ہے کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے ۔ رومن کے حامیوں کو وہ خط حسین نظر آتا ہے اور نسخ کے حامیوں کو یہ زیادہ جاذب نظر معلوم ہوتا ہے اور اگر نستعلیق کے معاملے میں

نسخ اتنا خوبصورت نہیں تو نہ سہی ، اس میں ان دقتوں کا حل تو موجود ہے جو ہماری زبان کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں۔ یہ ایک ایسا حل ہے جو زبان کی حدود اور اس کے رسم الخط کی قیود میں رہتے ہوئے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں کوئی نقصان ہے نہ خامی۔ مزید برآں نستعلیق کا وجود اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ اعلیٰ اور نفیس چھپائی کے لیے عکسی قطعات اور رنگین کتابت کے لیے اس کا باقی رکھنا ضروری ہے۔ خطاطی ایک فن ہے اور فن بھی بڑا لطیف اور پیارا۔ ہر دور میں ماہر خطاطوں نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا اور اسے فن کی معراج سے روشناس کرایا۔ آج بھی ان کی خطاطی کے نمونے ہمارے لیے موجب فرحت اور باعث فخر ہیں۔ ان کا فن زندہ جاوید ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے موجب افتخار۔ اس سے ہر دور میں کام لیا جائے گا اور دیوان غالب ایسی کتابیں جو ادب میں الہام کا مقام رکھتی ہیں اس میں پوری زیبائش اور رعنائی سے چھپتی رہیں گی۔ لیکن روزمرہ ضرورت کی کتابیں ، علمی اور فنی کارنامے ، رسائل اور اخبارات یہ سب تو نسخ ہی میں چھپیں گے۔ دفتری کاروبار بھی نسخ میں اسی سہولت سے ہو سکتا ہے جس سہولت سے رومن میں ، ٹائپ رائٹر موجود ہیں۔ ٹائپسٹ بڑی آسانی سے اس مشین پر کام کرنا بھی سیکھ لیتے ہیں اردو کا شارٹ ہینڈ رائج ہو چکا ہے۔ اسے اور بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن طباعت کے علاوہ رومن کے حق میں جو دلائل اوپر مذکور ہوئے۔ جب تک ان پر غور نہ کیا جائے نسخ کی برتری ثابت نہیں ہو سکتی۔ لہذا آئندہ سطور میں انہی دلائل کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔

بادی النظر میں یہ دلیل کہ رومن رسم الخط کو جاننا اور اس کے وسیلے سے اردو زبان سیکھنا بہت سہل ہوگا اور اس طرح پورے ملک کو خواندہ بنایا جا سکے گا۔ بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ موجودہ انگریزی خط میں جو اس وقت لاطینی رسم الخط کے ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہی موجودہ حالات میں ہمارے پیش نظر ہے ، کل چھبیس (۲۶) حروف ہیں۔ اکیس (۲۱)

حروف صحیح ، پانچ (۵) حروف علت یعنی Vowels لیکن آوازیں اکیس نہیں بلکہ چونتیس (۳۴) ہیں ۔ باقی تیرہ (۱۳) آوازوں کے لیے مرکبات سے کام لیا جاتا ہے ۔ مثلاً ''ش'' کے لیے SH ''چ'' کے لیے CH وغیرہ ۔ اور پھر یہ آوازیں دوسرے مرکبات سے بھی ادا ہو جاتی ہیں ۔ مثلاً ''ش'' کے لیے SH کے علاوہ TIO اور CH کام دیتے ہیں ۔ جیسے Share ، Station ، Debauch ''چ'' کے لیے CH کے علاوہ ''TU'' مثلاً Teacher اور Tincture اور پھر یہی CH ''ک'' کی آواز کے لیے بھی کام آتا ہے مثلاً Character یا Psychology اسی ''ک'' کی آواز کے لیے کبھی K اور کبھی C جس میں ک کی آواز کا شائبہ بھی نظر نہیں ، اور کبھی دونوں مل کر یعنی CK استعمال ہوتے ہیں ۔ مثلاً Kite ، Cat ، Amock ۔ ''ز'' کے لیے S اور Z دونوں کام آتے ہیں Revise اور Zebra ۔ و کے لیے O ، OO ، U ، VO ۔ الف کے لیے A ، AU ، AW وغیرہ ۔

''ای'' کے لیے E ، EE ، EA ، EI ، I ، IE اور Y وغیرہ ۔

ف کے لیے F اور PH جیسے Fat اور Physics میں ۔ ج کے لیے کبھی G اور کبھی J ۔ ک ، س کی مرکب آواز کے لیے X بھی ہے اور KS بھی ۔

بعض حروف لکھنے میں آتے ہیں آواز نہیں دیتے ۔ اردو میں بھی حروف شمسی وغیرہ میں یہ بات موجود ہے ۔ لیکن کسی قاعدے کے ساتھ یہاں یہ چیز بڑی بے قاعدہ ہے اور کسی ایک حرف تک محدود نہیں ۔

مثالی رسم الخط میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ ہر آواز کے لیے ایک حرف موجود ہو اور ہر حرف کی ایک اور صرف ایک آواز ہو تا کہ سیکھنے والا ابہام اور الجھن کا شکار نہ ہونے پائے ۔ اردو کے موجودہ رسم الخط پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم صوت یا قریب الصوت آوازوں کے لیے ایک سے زیادہ حروف ہیں ۔ مثلاً ث ، س ، ص وغیرہ ، تو یہ خامی تو رومن میں اس سے بھی بڑھ کر ہے ۔ اس لیے اگر اس سہولت کے پیش نظر رومن کو اپنانا ہے تو یہ مشکل آسان نہیں ہوگی بلکہ اس میں اور پیچیدگی آ جائے گی ۔

انگریزی تلفظ جس قدر بے قاعدہ اور بے ڈھب ہے اور اس کے ہجے جس قدر مشکل اور مبہم ہیں کسی سے مخفی نہیں مثلاً Often ، Talk ، Knowledge ، Psychology ، Hour -

۱ - A کی آواز کبھی زیادہ کھلتی ہے کبھی کم ، لیکن اس کے لیے علامت کوئی نہیں -

۲ - E کی آواز The ، There ، Then ، Here چاروں حروف میں اس کی مختلف اٹھان اور مختلف ابھار ہے -

۳ - ''I'' کی آواز Pin ، Tide ، Machine سب میں الگ الگ ہے -

۴ - ''O'' کی آواز God ، Gold ، Good ، Tool ، Shoe اور Does سب میں جدا -

۵ - ''U'' کی آواز But ، Put ، Tube سب میں الگ الگ ہے -

اس بے قاعدہ تلفظ کی مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں - بلا شبہ تلفظ ایک سماعی مسئلہ ہے قیاسی نہیں - لیکن سماع میں بھی ایک ڈھب اور قرینہ تو ہونا چاہیے - اب خواہ مخواہ رومن کو اپنا کر اس کی جملہ بے قاعدگیوں کو دعوت دینا اور پھر ان کا علاج سوچنا ہے - انگریزی تلفظ اور املا کی دقتوں سے تو خود اہل زبان نالاں ہیں - یہاں تک کہ ایک انگریز نقاد نے کہا کہ ہماری دو زبانیں ہیں ، ایک تقریری انگریزی اوز دوسری تحریری - اگر بالفرض رومن کو اپنا لیا جائے تو حروف کی تعداد میں یقیناً اضافہ کرنا ہوگا - اس لیے کہ ان حروف سے کام نہیں چلے گا - آوازوں اور علامتوں کے قاعدے مقرر کرنے ہوں گے - ت ، خ ، د ، ڈ ، ش ، غ چھ (۶) حروف کا اضافہ تو لازمی ہے لیکن اس کے بعد بھی اردو کی تمام آوازیں ، اس سے ادا نہ ہو سکیں گی - الف مقصورہ اور ممدودہ اے اور اے ، نون اور نون غنہ میں امتیاز کرنے کے لیے علامات مقرر کرنا ہوں گی اور اگر یہ علامات لکیروں اور نقطوں کی صورت میں ہوں گی تو اعراب سے چھٹکارا تو حاصل نہ ہوا - بلکہ طلباء اس چکر میں بدستور پھنسے رہے - اگر ہم رومن کے حروف تہجی میں C اور X کو بے کار سمجھ کر خارج کر دیں اور چھ نئے مذکورہ بالا الفاظ بڑھا لیں اور ۱۶ حروف علت کے نشان بڑھائیں کہ

ان کے بغیر نئی تہجی ہماری آوازوں کی ادائیگی سے قاصر رہے گی تو کل ۴۶ حروف بن جائیں گے ۔ اب تحریری حروف الگ اور چھاپے کے حروف الگ، چھوٹے حروف جدا اور بڑے حروف جدا ۔ پھر ان میں سے اکثر کی شکلیں ایک دوسرے سے مختلف مثلاً

| | | | |
|---|---|---|---|
| B | *B* | b | *b* |
| G | *G* | g | *g* |

ان سب کے سیکھنے میں سہولت کیسے ہو سکتی ہے ۔ اردو کے پانچ حروف تہجی کو جن میں قریب قریب آواز کی ادائیگی کی صلاحیت ہے، چھوڑ کر انگریزی کے اس سے دگنے بلکہ تگنے حروف کی شکلیں سیکھیں یہ کہاں کی دانشمندی ہے ۔

اردو میں بلاشبہ ہر حرف کی عموماً دو تین صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ لیکن یہ ترکیبی شکلیں اپنے اصل سے الگ نہیں ہوتیں ۔ بلکہ اصل حروف کی طرف فوراً اشارہ کرتی ہیں اور جس طرح انسان اپنے چہرے سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح حروف اپنی ترکیبی صورتوں سے پہچان لیے جاتے ہیں اور پڑھنے میں قطعاً کوئی دقت نہیں ہوتی ۔ یہی ترکیبی صورتیں اردو کے خط کو جاذب نظر بناتی ہیں ۔ انہی کی وجہ سے تیزی سے لکھا جا سکتا ہے اور انہی کے باعث عبارت تیزی سے پڑھی جاتی ہے ۔ پھر موجودہ خط میں اعراب حروف کا ضروری حصہ نہیں ہیں ۔ بلکہ حسب ضرورت لگائے جا سکتے ہیں اور بڑے بچوں کی کتابوں میں انہیں بہت کم استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس لیے ٹائپ میں بھی اعراب شاذ و نادر ہی استعمال ہوتے ہیں حالانکہ رومن کے اپنانے کی صورت میں ہمیں اعراب کو آواز کے تعین کے لیے بعض حروف میں شامل کرنا پڑے گا اور اس علامت کو اس حرف سے جدا نہیں کیا جا سکے گا ۔

رومن کے سہل ہونے میں اس کے حروف کا الگ الگ لکھے جانا دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ اس کے پڑھنے میں وقت زیادہ لگتا ہے اور دقت بھی ہوتی ہے ۔ اردو کا موجودہ خط ان دونوں عیوب

سے پاک و مبرا ہے۔ حروف اور الفاظ کا وصل اسی حد تک روا رکھا جاتا ہے جہاں تک پڑھنے میں سہولت باقی رہتی ہے۔ لفظ کا ایک سرا اور اس کا ایک جوڑ فوراً پورے لفظ کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اردو کتابیں، سلائیڈیں اور اشتہارات ہم انگریزی یا رومن کی نسبت جلد پڑھ جاتے ہیں۔ اس سے حافظے پر بار کم پڑتا ہے اور قرأت میں روانی پیدا ہوتی ہے۔

رومن رسم الخط اپنانے سے تعلیم میں بعض لاینحل دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم صورت لیکن مختلف المعانی الفاظ کو ایک ہی طرح لکھنا پڑے گا۔ پھر الم اور علم "Alam" بن کے رہ جائیں گے اور پڑھنے والا غلطی سے اسے عالم بھی پڑھ لے گا۔ ثواب اور صواب، آم اور عام، سہی اور صحیح، سدا اور صدا، سینکڑوں ہی ایسے الفاظ ہوں گے جن کے معانی سیاق و سباق کی مدد کے بغیر سمجھ میں نہیں آئیں گے اور اس رہنمائی کے بعد بھی شاید یہ مشکل حل نہ ہو سکے۔ اردو کے مختلف ہجوں سے لکھے جانے والے الفاظ فوراً اپنے مادوں کا پتہ دیتے ہیں اور معانی کا بھید یک لخت کھل جاتا ہے۔ موجودہ خط افہام و تفہیم کی منزل کا راستہ ہموار کر دیتا ہے۔ رومن میں صدہا الفاظ اپنا اصل تلفظ کھو بیٹھیں گے۔ انگریزی ہی کے تلفظ سے تانگہ ٹانگہ ہو گیا ہے اور تاتا ٹاٹا۔

اب رہا خواندگی اور ناخواندگی کا مسئلہ، جب یہی ثابت نہیں ہو سکا کہ رومن کا سیکھنا اردو کے سیکھنے سے سہل ہے تو خواندگی کیسے عام ہو گی۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ اس خط کے اپنانے سے خواندہ حضرات (وہ پڑھے لکھے جو صرف اردو رسم الخط سے واقف ہیں) ناخواندہ افراد کی صف میں شامل ہو جائیں گے اور جب تک یہ رسم الخط نہ سیکھ پائیں گے ناخواندہ ہی رہیں گے۔ گویا اس اقدام سے خواندگی کی ترقی، ترقی معکوس ہو گی۔ موجودہ اردو خط رومن کی نسبت خواندگی کی اشاعت میں زیادہ مفید ہے۔ اس لیے کہ یہ خط اور قرآن مجید کا خط تقریباً ایک ہے۔ قرآن مجید پڑھنا مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کی تعلیم کا گاؤں گاؤں انتظام ہے۔ وہ مرد اور عورتیں جو ناظرہ قرآن

مجید پڑھ سکتے ہیں بآسانی اردو پڑھنا سیکھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی۔ رومن کے نفاذ کے بعد یا انہیں دونوں رسم الخط سیکھنے ہوں گے یا پھر ایک زبان کی قرأت سے بے بہرہ رہنا ہو گا۔ خواندگی رسم الخط کے بدلنے سے نہیں بڑھے گی۔ جہالت کا تعلق محض رسم الخط سے نہیں ہے بلکہ انسداد کے لیے ہمیں تعلیم بالغاں کے مراکز میں اضافہ کرنا ہوگا۔ مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ سستی اور عمدہ کتابیں فراہم کرنا ہوں گی۔ بنیادی ذخیرۂ الفاظ کی فہرست تیار کرنا ہوگی۔ تعلیم کو دلچسپ بنانا ہوگا اور اشاعت تعلیم کے مرغوب حربے یعنی فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو کام میں لانا ہوگا۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آج بھی اس کی خواندگی کی شرح قابل رشک نہیں اور اس شرح میں بھی جو اضافہ ہوا وہ رسم الخط کا مرہون نہیں بلکہ اس میں دوسری کوششوں کو دخل ہے جو اشاعت تعلیم کے سلسلے میں کی گئیں۔ ترکی کے عوام پر ایک اثر ضرور ہوا کہ وہ دین کے سرچشمے عربی سے بہت دور ہو گئے۔ وہ ترکی میں قرآن مجید کے تراجم تو پڑھ لیتے ہیں لیکن اصل متن سے جس کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے موجب ثواب اور باعث برکت بلکہ لازمی اور ضروری ہے محروم ہو گئے۔

دوسری دلیل جس کا اوپر ذکر ہوا علم اللسان کے فقدان پر دلالت کرتی ہے۔ بنگالی اور اردو دونوں کو رومن میں لکھنے سے نئی زبان پیدا نہ ہوگی۔ فارسی اور عربی کا ایک رسم الخط ہے۔ بلکہ فارسی میں عربی کے بے شمار الفاظ بھی موجود ہیں۔ لیکن دونوں زبانیں اپنے تاریخی، مذہبی اور ثقافتی روابط کے باوجود الگ الگ زبانیں ہیں اور ایک کی تحصیل سے دوسری زبان خود بخود نہیں آ جاتی۔ فارسی کا عالم عربی بول اور لکھ نہیں سکتا۔ اسی طرح عربی کا عالم فارسی سے ناآشنا رہتا ہے۔ تاآنکہ وہ فارسی کو بحیثیت ایک زبان کے نہ پڑھے۔ انگریزی اور فرانسیسی کا رسم الخط ایک ہے لیکن ان دونوں کے اتحاد سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی۔ دور کیوں جائیں انگلستان ہی میں ویلز کی زبان انگریزی سے مختلف ہے۔ اردو اور بنگالی نئے رسم خط کو اپنانے

کے بعد بھی دو الگ الگ زبانیں رہیں گی۔ نئی زبان کی پیدائش کا عمل غیر شعوری اور فطری ہوتا ہے اور اس عمل میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ زبانیں محض رسم الخط کے اتحاد سے نہیں بلکہ مختلف بولیاں بولنے والے افراد کے میل جول سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مختلف بولیوں کے ملاپ سے ہر بولی کچھ اثرات تو قبول کر لے لیکن نئی زبان جنم نہ لے۔ زبان کی تخلیق کے معاملے میں انسان کی شعوری کوششیں کارگر ہوئی ہیں نہ ہو سکتی ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور عربی کا سکہ ہر جگہ چلتا ہے۔ لیکن بچاری اسپرانٹو کو اب کوئی جانتا بھی نہیں۔ جو انسان سنگترے کی بجائے رنگترہ رائج نہ کر سکے وہ نئی زبان کیونکر معرض وجود میں لا سکتا ہے۔ نئی زبان پیدا کرنے کی نسبت بنگالیوں کے لیے اردو سیکھنا اور مغربی پاکستان کے باسیوں کے لیے بنگالی سیکھنا یقیناً سہل کام ہے۔ اردو اور بنگلہ کو ویسے بھی قریب لانا چاہیے۔ رسم الخط کے ذریعہ انہیں قریب لانے کا مسئلہ تو ایسا ہے جیسا ہندی اور اُردو کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ یعنی اگر ہندی کو اردو اور اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنا گوارا نہیں تو چلو دونوں کو لاطینی میں لکھیے۔

تیسری دلیل یہ کہ اس کے اختیار کرنے سے طلباء کا دوسری زبانیں سیکھنے کا کام آسان ہو جائے گا، محل نظر ہے۔ اس دلیل کے پیش کرنے والے دوستوں کے ذہن میں یقیناً تیسری زبان فارسی یا عربی یا کوئی اور ایسی زبان ہو جو رومن خط میں نہیں لکھی جاتی تو اس سے کام میں سہولت تو کجا دقت پیدا ہوگی، اور یہ بات بھی سند کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اس ملک میں انگریزی کا سکہ تاابد چلتا رہے گا، اور یہ مدارس میں اسی طور رائج رہے گی جس طرح کہ آج ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رومن رسم الخط میں اردو پڑھا لکھا انسان انگریزی نسبتاً سہولت سے سیکھ لے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب ایک رسم الخط دوسری زبان کے لیے اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں اس قدر تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں کہ اس سے اس خط میں لکھی جانے والی زبان کی تحصیل میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ ماسوائے اس کے کہ

دونوں زبانوں میں رسم الخط کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ، گرامر کے اصولوں اور دوسری جزئیات میں اشتراک ہو۔ اس تبدیلی میں کچھ حروف بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ کچھ نئے حروف اختراع کر لیے جاتے ہیں۔ کچھ حروف اپنی آواز بدل لیتے ہیں۔ کچھ آوازیں نئے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں لب و لہجہ، صوتی تغیرات علاقائی اثرات یہ سب مل کر زبان اور اس کے رسم الخط کو وہ رنگ بخشتے ہیں کہ اسی رسم الخط میں لکھی جانے والی زبان کا اپنی دوسری ہم خط زبانوں سے کوئی خاص علاقہ اور تعلق نہیں رہتا۔ آج انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، ترکی، جرمن، روسی، لاطینی سب ایک ہی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن کیا ان کے تلفظ میں، حروف تہجی میں، آوازوں میں اختلاف نہیں۔ لفظ 'V' کو دیکھیے انگریزی میں 'و اور جرمن میں 'ف' کی آواز دیتا ہے 'R' فرانسیسی میں 'غ' کی طرح بولا جاتا ہے اور G اسی زبان میں 'ی' کی طرح۔ T انگریزی میں 'ٹ' لیکن فرانسیسی میں ت کی آواز دیتا ہے۔ H اطالوی میں 'ک' کی آواز پیدا کرتا ہے حالانکہ انگریزی میں کبھی ساکن اور کبھی 'ح' کی طرح بولا جاتا ہے۔ علی ھذالقیاس 'C' اطالوی میں 'چ' اور ترکی میں 'ج' کی آواز دیتا ہے۔

ماہرین لسانیات کی متفقہ رائے ہے کہ تحصیل زبان، عادات لسانی پیدا کرنے سے عبارت ہے اور ہر زبان آوازوں، تلفظ، بول چال اور روزمرہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہے کہ ہر زبان کے سیکھنے کے لیے نئی عادات لسانی پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ مادری زبان میں سیکھی ہوئی عادات کو بھولنا اور نئی زبان کی عادات پیدا کرنا اسی میں کامیابی کا راز ہے۔ انگریزی اور اردو، رسم الخط کی وحدت کے باوجود بھی دوسرے تمام اعتبارات سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ تحصیل اردو کے بعد تحصیل انگریزی اتنا ہی کٹھن کام رہے گا جتنا آج ہے۔ بلکہ ہماری ناقص رائے تو یہ ہے کہ یہ مہارت جو رومن اردو میں حاصل ہوگی تحصیل انگریزی کے راستے کو ناہموار کر دے گی۔ اس لیے کہ انگریزی پڑھتے وقت اسی انداز میں

لکھے اور پڑھے ہوئے اردو الفاظ غیر شعوری طور پر ذہن میں آتے رہیں گے - اردو الفاظ کا بصری تصور ذہن میں اس قدر راسخ ہوگا کہ شروع شروع میں مبتدی کو ان کا بھولنا اور نئے لفظ اور ان کا تلفظ سیکھنا مشکل ہو جائے گا - ایک فائدہ جو نظر آتا ہے وہ خط سے متعلق ہے - ہو سکتا ہے لڑکے پہلے سے خوشخط لکھنے لگیں - لیکن اس کا تعلق مشق ، مہارت اور رجحان طبع سے ہے - یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جن کا اردو کا خط اچھا ہوتا ہے وہ انگریزی بھی خوبصورت لکھتے ہیں اور بہتیرے جو انگریزی کے سوا کوئی دوسرا خط نہیں سیکھتے بہت برا لکھتے ہیں - لیکن اس فائدے کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی یہ سودا مہنگا پڑے گا - سو نقائص کے عوض ایک فائدہ حاصل کرنا خلاف عقل اقدام ہے - ثانوی زبان کی تحصیل میں آسانی پیدا کرنے کے لیے قومی زبان کے فوائد کی قربانی قرین مصلحت نہیں - ثانوی زبان ایک فی صد افراد بھی نہیں سیکھتے جبکہ قومی زبان کا سیکھنا سب پر لازم آتا ہے - اقلیت کی خاطر اکثریت کو مشکلات میں پھنسانا ناروا ہے -

چوتھی دلیل کہ رومن کے اپنانے سے اردو کا وقار بڑھ جائے گا اور یہ مغربی زبانوں کے ہم پلہ ہو جائے گی خوش فہمی پر مبنی ہے - کسی زبان کا وقار صرف اس کے رسم الخط میں پوشیدہ نہیں ہوتا - بہتیری زبانیں لاطینی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہیں لیکن لوگ سیکھتے ہیں تو انگریزی یا فرانسیسی یا جرمن - زبان کے وقار کو بلند کرنے کے اور ذرائع ہیں - اردو ادب العالیہ کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کے ذریعے پہنچائیے - اپنی زبان کے کارناموں اور شاہکاروں سے دوسروں کو متعارف کرائیے - علمی و ادبی شہ پارے تخلیق کیجیے - اس زبان میں وہ بات پیدا کیجیے کہ لوگ خود کھنچے چلے آئیں - عربوں نے یونانی کیوں سیکھی ؟ اہل فارس کو عربی پڑھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ یورپ والے عربی اور فارسی کے کیونکر مرہون منت رہے - آج سعدی ، حافظ اور عمر خیام کے کارنامے یورپ کی کس زبان میں موجود نہیں - کلیلہ د منہ سنسکرت سے نکل کر ہر زبان میں کیسے

جا پہنچی ۔ انگریزی کا بول بالا کیونکر ہوا ؟ اردو کے محسن و مربی گارساں د تاسی اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کہاں سے آئے ؟ میجر فلر اور کرنل ہالرائڈ کو اردو سے لگاؤ کیوں کر پیدا ہوا ؟ اس وقت بھی اردو اسی خط میں لکھی جاتی تھی ۔ یہ زبان آج بھی مؤقر ہے ۔ آج بھی باہر والوں کی نظر میں یہ کچھ کم رتبہ نہیں ہے ۔ یو ۔ این ۔ او کی زبانوں کی فہرست میں اس کا پانچواں نمبر ہے ۔ آج بھی کلام اقبال کے دوسری زبانوں میں ترجمے ہو رہے ہیں ۔ انگریزی ، عربی ، اطالوی وغیرہ میں علامہ کی بعض کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں ۔ اگر ہم مزید کوشش کریں تو اس کی قدر و منزلت میں اور بھی اضافہ ہو سکتا ہے ۔ بشرطیکہ ہم ان راہوں پر چلیں جو زبان کو بام عروج تک لے جانے کی راہیں ہیں اور زبان کو ان خطوط پر چلائیں جو اس کے معراج کی ضامن ہیں ۔ زبان کی توقیر اس کو بولنے والی قوم کی توقیر سے وابستہ ہوا کرتی ہے ۔ زبانیں قوموں سے بنتی ہیں اور قومیں زبانوں سے ۔ جو قوم مر جاتی ہے اس کی زبان ، ثقافت ، اس کا ادب سب قعر گمنامی میں چلے جاتے ہیں ۔ چینی آج زندہ ہے ۔ اس کی زبان اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود زندہ ہے ۔ اسرائیل نے جب سے جنم لیا ہے ، عبرانی کے قالب مردہ میں نئی روح دوڑ گئی ہے ۔ جاپانی رسم الخط کی خرابیوں کے باوجود زندہ ہے ۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد بھاشا اور سنسکرت ایسی بھولی بسری زبانیں پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئی ہیں اور پھر اردو کو صرف مغرب میں زندہ کرنا مقصود نہیں ۔ اسے مشرق میں بھی مقبول بنانا ہے اور مشرق اس وقت نسخ کی لپیٹ میں ہے نہ کہ رومن کی ۔

آخری دلیل جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ رسم الخط کی تبدیلی غیر ملکیوں کو اردو سیکھنے پر آمادہ کرے گی قابل التفات نہیں ۔ کون سے غیر ملکی ؟ کیا افغان بھائی اور ایرانی دوست اسے رومن میں لکھا دیکھ کر اسے خوش آمدید کہیں گے ؟ کیا بھارت اسے نئے روپ میں دیکھ کر پھر سے سینے لگا لے گا ؟ کیا برمی ، سیامی ، چینی ، تبتی ، ملائی ، انڈونیشی سب رومن کے دلدادہ ہیں کہ انہیں رومن کے

ذریعہ اردو سیکھنے کی تشویق ہو گی۔ باقی رہے اہل مغرب تو جب انگلستان والوں کو اردو سیکھنا تھی تو وہ استاد رکھ کر اسے باقاعدہ پڑھا کرتے تھے۔ بعض انگریزوں نے تو یہاں تک مشق بہم پہنچائی کہ اردو میں شعر و شاعری کا بھی شوق فرمانے لگے۔ اب بھی جو اردو سیکھنے کا متمنی ہے وہ اسے ہر حال میں سیکھے گا۔ اہل انگلستان نے ہندوستانیوں کو انگریزی سکھانے کے لیے اپنا رسم الخط نہ بدلا۔ ہم انہیں اردو سکھانے کے لیے اپنا خط بدل دیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے ؟

یہ تو تھے دلائل اور ان کے جوابات۔ اب کچھ حقائق ملاحظہ فرمائیے۔ رسم الخط کی اس تبدیلی کا سب سے بڑا اور سب سے برا اثر ہمارے ادبی، علمی، مذہبی اور ثقافتی سرمائے پر ہوگا۔ نئی کتابیں تو ہم رومن میں چھاپ ہی لیں گے۔ پرانی کتابوں کا کیا ہوگا۔ کیا وہ نئی نسل کے لیے ایک چیستان یا معمے سے کچھ زیادہ وقعت کی مالک ہوں گی۔ قرآن مجید کے تراجم اور تفسیریں، فلسفے اور منطق پر ضخیم کتابیں، شعراء کے دوادین اور کلیات، داستان گوؤں کی داستانیں ، نقادوں کے تنقیدی کارنامے ، تذکرہ نگاروں کے تذکرے۔ مؤرخوں کی تاریخیں، علوم و فنون پر لکھی ہوئی کتابیں، انجمن ترقی اردو، دارالترجمہ حیدر آباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ ایسے اداروں کی علمی و ادبی تحقیقات کیا الماریوں کی زینت بن کر رہ جائیں گی۔ کیا ہماری نسل ان سے بیگانہ ہو جائے گی اور یہ سب کچھ ان کے لیے گلدستہ طاق نسیان بن جائے گا۔ یہ سارا سرمایہ رومن میں کیونکر منتقل ہوگا ؟ آج ایک شاعر کا دیوان چھاپنے کو کوئی ناشر تیار نہیں ہوتا۔ سینکڑوں دیوان اور کلیات کون چھاپے گا ؟ جہاں محقق کو اپنا تحقیقی مقالہ اپنے مصارف سے چھپوانا پڑے وہاں نایاب کتابوں کو کون شائع کرے گا ؟ اس میں تو ترکی کو بھی ناکامی ہوئی۔ پاکستان کیونکر کامیاب ہوگا ؟ اور اگر ان سب تک رسائی کے لیے اردو رسم الخط بھی سیکھنا پڑے تو خط کی تبدیلی کا کیا فائدہ ؟

اردو کا عربی اور فارسی سے صدیوں کا ساتھ ہے۔ اردو کا تغذیہ انہی دو زبانوں سے ہوا ہے۔ علوم کے سارے سوتے انہی دو زبانوں سے

پھوٹے ہیں۔ کیا تبدیلی خط سے یہ رشتہ تو نہ چھوٹ جائے گا۔ اگر دریا اپنے سرچشموں سے کٹ جائے تو اس کا سوکھ جانا یقینی ہے۔ آج اصطلاحات سازی، نئے الفاظ ڈھالنے، اصول مرتب کرنے غرض ہر معاملے میں فارسی اور عربی سے استمداد کرتے ہیں۔ اردو ہر قدم پر فارسی کی مرہون رہی ہے۔ اس کی شاعری اُس کی شاعری کی۔ اس کا ادب اس کے ادب کا۔ غرض کہ اس کا انگ انگ اور اس کی رگ رگ اس کی احسان مند ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کے بعد اگر ہم فارسی اور عربی سے بے بہرہ ہو گئے تو اپنی زبان کا کیا حشر ہو گا؟

عربی ہماری مذہبی زبان ہے۔ اگر رومن کے بعد عربی رسم الخط نہ سیکھا تو مذہب کا خدا حافظ۔ قرآن مجید کا پڑھنا ناممکن، اور اگر رومن کے ساتھ ساتھ عربی خط بھی سیکھا تو پھر خط بدلنے سے سراسر نقصان۔ ہر وہ شخص جس کا مقصد انگریزی سیکھنا نہیں دو خطوں میں اُلجھ جائے گا اور دو گونہ بوجھ تلے دب جائے گا۔ یہ تعلیم میں سہولت کیا ہوئی مصیبت بن گئی۔

رسم الخط کی تبدیلی تعلیمی دُنیا میں انحطاط کا موجب ہو گی۔ علمی ترقی کے میدان میں ہمیں اس وقت تک رکے رہنا ہوگا جب تک ہم اس خط کے تمام مصائب کو دور نہ کر لیں اور اس میں اپنے کام کو چلانے کے لیے ضروری سرمایۂ کتب بہم نہ پہنچا لیں اور ایک غریب ملک کے لیے اتنا بڑا انقلاب برپا کرنا سہل نہیں۔

آج جبکہ ہم ذریعۂ تعلیم بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، ساری قومی زندگی میں اردو کا عمل دخل اور بول بالا چاہتے ہیں، دفتروں اور عدالتوں میں اردو کو لا بٹھانا چاہتے ہیں، اس تبدیلی سے یہ سارے کام رک جائیں گے۔ ہماری توجہ اس کام سے ہٹ کر رسم الخط میں لگ جائے گی اور یہ سارے تعلیمی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

اردو شاعری میں تاریخی قطعات کا ایک خاص مقام ہے۔ شاعروں، ادیبوں، قومی رہنماؤں کے سن وفات کی ابدی یادگاریں، تاریخی عمارات کے سن تعمیر کے جاودانی نقوش حروف ابجد کے مٹتے ہی معدوم ہو

جائیں گے ۔ نہ حروف رہیں گے نہ حساب جمل ۔ اللہ اللہ خیر صلیٰ ۔ اردو شاعری میں کبھی سہی اور صحیح کے قافیے کو درست مان لیتے تھے ۔ اور بھی اس قسم کی بے اعتدالیاں ہمارے ابتدائی دور میں جائز سمجھی جاتی تھیں ۔ ہمارے اسلاف نے بڑی محنت اور بڑے ریاض سے زبان کو تراش خراش کے صاف کیا ۔ زبان کی کثافت کو دور کیا ۔ ردیف و قافیے کے قاعدے مقرر کیے ۔ رومن خط اس سارے کیے پر پانی پھیر دے گا ۔ پھر سے وہی نقائص جلوہ نما ہوں گے ۔ لفظی صنعتوں کا کمال جو ہمارے شعراء کے فن کی معراج سمجھا جاتا رہا ہے ، اب کوڑیوں کے مول بکے گا ۔ فارسی اور عربی کی نئی اور پرانی کتابوں ، رسائل اور اخبارات سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا ۔ عیسائی مشنریوں نے تبلیغ کے لیے رومن خط کو اپنایا ، لیکن کامیابی نہ ہو سکی ۔ آخر اسے غیر مفید پا کر ترک کیا اور اس کے بجائے اردو رسم الخط میں اپنا تبلیغی لٹریچر شائع کیا ۔ اور آج اسی رسم الخط میں ان کی تمام مذہبی کتب شائع کی جاتی ہیں ۔ اس تجربے کو دہرانے کا فائدہ ؟

ہمسایہ ممالک سے روابط استوار کرنا ، دور حاضر کی سیاست کا اہم تقاضا ہے ۔ ہمسایہ ممالک سے مادی ، معنوی ، تجارتی ، اقتصادی تعلقات بڑھانا قومی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے ۔ قریب ترین ہمسائیوں میں سے ایک طرف بھارت ہے ۔ جہاں رسم الخط ناگری ہے یا پھر اردو ۔ افغانستان اور ایران میں نسخ رائج ہے ۔ سعودی عرب ، شام ، عراق ، لبنان ، سواحل خلیج ، فارس ، تبت ، چین ، جاپان ، افریقہ کہیں بھی لاطینی خط رائج نہیں ہے ۔ خود پاکستان مختلف بولیوں اور زبانوں کا گھر ہے ۔ پشتو ، پنجابی ، سندھی ، بلوچی ، بنگالی کوئی ایک بھی رومن میں نہیں لکھی جاتی ۔ اردو کے لیے اگر رومن خط اختیار کر لیا گیا تو یہ زبان اپنی زبانوں سے دور ہو جائے گی ۔ یا تو ان زبانوں کے لیے رومن اختیار کرنا ہوگا ورنہ دونوں رسم الخط سیکھنے ہوں گے ۔

ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کی رائے اگر کچھ وقعت رکھ سکتی ہے تو یقیناً موجودہ رسم الخط کو نسخ اور نستعلیق دونوں صورتوں میں بحال رکھنا ہوگا ۔ بنگال سے جو خبریں آ رہی ہیں وہ رومن کے لیے حوصلہ افزا

نہیں ہیں ۔ مغربی پاکستان کے لوگ بھی موجودہ خط ہی کے حامی ہیں ۔ اردو کانفرنس لاہور ۱۹۵۹ء میں منظور شدہ واضح قرارداد میں اسی خط کی حمایت کی گئی تھی ۔ یہی صورت حال کراچی اور دوسرے بڑے شہروں میں ہے ۔ کیا عوام اور کیا خواص سب نسخ کے دلدادہ اور اسی خط کے متمنی نظر آتے ہیں ۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے ۔ اس کا موجودہ رسم الخط بھی مخلوط ہے ۔ جس میں فارسی ، عربی ، ہندی ، تمام زبانوں کے حروف اور آوازیں موجود ہیں اور ان تمام زبانوں کے الفاظ ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ تبدیلیٔ خط سے زبان کی ماہیت بدل جائے گی ۔ شیرینی و لطافت کی بجائے کثافت جگہ پائے گی ۔ قاعدے اور قانون بے راہ روی کا شکار ہو جائیں گے ۔ تحقیق و تجسس کی راہیں مسدود ہو جائیں گی ۔ الفاظ کے مادوں سے ہم دور اور الفاظ کے اصل معانی ہم سے اوجھل ہو جائیں گے ۔ یہاں مشرقیت کی جڑیں کھوکھلی اور مغربیت کی بنیادیں مضبوط تر ہو جائیں گی اور ہم اپنے سہاروں سے کٹ کر غیروں کے دوارے جا پڑیں گے ۔

---

# تدریس کے نظریات اور عمل میں تفاوت اور اس کا تدارک*

موضوع بحث یہ ہے کہ تدریس کے نظریے اور عمل میں جو تضاد یا تفاوت موجود ہے اس کے عوامل اور وجوہ کیا ہیں اور ان کا ازالہ کیونکر ممکن ہے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال جو ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ تدریس کے نظریات سے ہماری مراد کیا ہے اور کیا واقعی نظریے اور عمل کے درمیان کوئی تضاد یا تفاوت موجود ہے ؟ جب تک ہم اس سوال کا جواب نہ دے لیں اس وقت تک اس کے عوامل اور وجوہ پر بحث اور اس کے ازالے کے لیے تجاویز پیش کرنا غیر ضروری ہوگا ۔

تعلیمی نظریات سے مراد وہ بنیادی اصول اور طریقہ ہائے تدریس ہیں جن کا جاننا اور جن پر عمل پیرا ہونا ایک تربیت یافتہ استاد کے لیے از بس ضروری ہے مثلاً تعلیم کا ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ تدریس میں طلباء کے انفرادی اختلافات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے ۔ یہ اصول جب تدریس کی صورت اختیار کرتا ہے تو انفرادی تدریس ، گروہی تدریس یا معالجاتی تدریس کے طریقے وجود میں آتے ہیں جن کے ذریعے انفرادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل تدریس انجام پذیر ہوتا ہے ۔ اسی طرح تدریس کا ایک اور بنیادی اصول یہ ہے کہ بچے کے حواس خمسہ کو جنہیں ''ابواب علم،، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے ۔ اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تدریس میں سمعی و بصری اعانات کا استعمال کیا جاتا ہے ۔

---

* یہ مقالہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی مجلس مذاکرہ منعقدہ ۱۹۷۰ء میں پڑھا گیا ۔

بچے کے لیے تدریس کو دلچسپ بنانا چاہیے.... یہ بھی ایک تعلیمی اصول ہے اور ''کھیل کھیل میں تعلیم'' اور ''دلچسپ فعالیتوں (Activities) کی ترویج'' اس کی عملی صورت ہے۔ ہمارے تربیتی ادارے زیر تربیت اساتذہ کو انہی تعلیمی اصولوں اور طریقہ ہائے تدریس کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ باقاعدہ معلم بننے کے بعد ان کی روشنی میں تعلیم دیں اور ان تدریسی طریقوں کو اپنائیں۔ اس سلسلے میں ہمارا عام مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر اساتذہ تربیت حاصل کرنے کے بعد ان اصولوں اور نظریات کا پورا پورا احترام نہیں کرتے اور مناسب طریقہ ہائے تدریس پر عمل پیرا ہونے کی بجائے ایسے طریقے استعمال کرتے ہیں جن سے تدریس کے علم و عمل میں تضاد واقع ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ تضاد بعض درسگاہوں میں زیادہ ہے اور بعض میں کم۔ اس میں شک نہیں کہ یہی تضاد ہمارے تعلیمی معیار کے انحطاط کا باعث ہے اور اس تضاد کو جس قدر کم کیا جائے اسی قدر معیار تعلیم بہتر ہوتا جائے گا۔

اب کہ تضاد کی موجودگی کا احساس ہر ماہر تعلیم کو ہے اور اس مرض کی باقاعدہ تشخیص بھی ہو چکی ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی جائے اور اس کے عوامل اور وجوہ کا کھوج لگایا جائے۔

۱۔ علم و عمل اور قول و فعل میں تضاد صرف اُستاد کی ذات یا درسگاہ کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا مرتکب پورا معاشرہ ہے اور ایک ایسی بیماری ہے جو پورے ملک بلکہ پوری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کیا یہ امر واقعی نہیں ہے کہ عام لین دین، کاروبار، مذہب، سیاست.... غرض زندگی کے ہر شعبے میں جن نظریات اور اصولوں کا پرچار کیا جاتا ہے خود ان کا پرچار کرنے والے ہی عملاً ان کی تکذیب میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ صلح و امن کے داعی سیاسی اغراض کے حصول کے لیے قتل و غارت سے بھی دریغ نہیں کرتے اور دوسروں کو شانتی اور آشتی کا اپدیش دینے والے پڑوسیوں کا سکھ چین تباہ کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے۔

عالمی بھائی چارے کا نعرہ ہو یا معاشرتی اخوت کا دعویٰ، ہمارے یہ سب اصول ہاتھی کے دانت بن کر رہ گئے ہیں جن کا تعلق دکھاوے سے ہے عمل سے نہیں ۔

ہمارا استاد اسی مجموعہ اضداد معاشرے کا فرد اور اسی تہذیب کی پیداوار ہے ۔ جب وہ اپنے معاشرے میں ہر روز اصول و نظریات کا خون ہوتا دیکھتا ہے تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سیکھتا ہے کہ تدریس کے اصول و نظریات کو دین و سیاست کے اصولوں اور نظریوں کی طرح مقدس تو ضرور سمجھو، ان کا پرچار بھی کرو لیکن ان پر عمل درآمد کچھ ایسا واجب نہیں۔ تاہم دکھاوے اور نمائش کے لیے گاہے گاہے ان پر عمل کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں بلکہ پیشے کے تقدس اور بھرم کو قائم رکھنے کے لیے یہ طریقہ مفید بھی ہے اور مجرب بھی۔ گویا آج کا استاد ان بے عمل واعظوں میں سے ہے جن کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے ''لما تقولون مالا تفعلون،، ۔

۲ ۔ انسان بالطبع سہل پسند اور بہانہ جو ہے ۔ ہر وہ کام جو محنت طلب اور ریاض کا متقاضی ہو وہ اس سے جی چراتا اور اس سے بچنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا ہے ۔ ایک عام استاد، عام انسان سے مختلف نہیں۔ ایسے اساتذہ آپ کو بہت کم ملیں گے جو بنیادی نظریات تعلیم اور جدید طریقہ ہائے تدریس کی افادیت ہی کے منکر ہوں بلکہ اساتذہ کی کثیر تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ان طریقوں اور اصولوں کے حسن و خوبی پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن ان پر عمل کرنے سے گریزاں ہیں ۔ بقول غالب :

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی !

اور اس گریز اور فرار کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ۔ ع

مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

استاد کی یہی کم ہمتی اور سہل پسندی اس کو ایسی راہیں سجھاتی ہے جہاں وہ محنت کیے بغیر ثمر کی تمنا کرتا ہے ۔

۶ - امتحان کا ذکر آیا تو لگے ھاتھوں امتحان کی بات بھی کرتے چلیں - ھم اپنی تعلیم کے مقاصد کے بارے میں کتنے ھی بلند بانگ دعوے کیوں نہ کریں - اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ طالب علم اور استاد دونوں کے نزدیک تعلیم کا سب سے بڑا مقصد امتحان پاس کرنا اور سند حاصل کرنا ھے - اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ھے کہ اگر بی - ایڈ کے طلباء ھی سے یہ سوال کیا جائے کہ اگر تربیتی کورس مکمل کیے بغیر انہیں بی-ایڈ کی ڈگری دے دی جائے تو وہ اس اقدام کا خیر مقدم کریں گے یا نہیں تو سب کے سب اس تجویز کو پسند فرمائیں گے اور اگر ان سے مزید پوچھا جائے کہ کیا اس تربیتی کورس کی عدم تکمیل کا ان کے تدریسی معیار پر ناخوشگوار اثر تو نہیں پڑے گا تو مجھے یقین ھے کہ ان میں سے اکثر یہی کہیں گے کہ ھرگز نہیں -

ایسے طریقہ ھائے تدریس جن سے طالب علم امتحان کو بآسانی پاس کر سکے اور استاد اپنی جماعت کے اچھے نتائج دکھا سکے - دونوں کے لیے قابل توجہ اور لائق التفات ھیں خواہ وہ تعلیمی نظریات اور اصول تدریس کے موافق ھوں یا متضاد - ھمارا طرز امتحان اتفاق سے ایسا ھے جس میں رٹے اور حافظے کو زیادہ دخل ھے اس لیے استاد اور شاگرد دونوں اسباق کو رٹنے اور رٹی ھوئی چیزوں کو من و عن سطح کاغذ پر آگل دینے کو منتہائے تعلیم قرار دیتے ھیں - جہاں تدریس کی معراج ''استغراق علمی'' کی بجائے ''استفراغ ذھنی'' ھو وھاں اصولوں کی پابندی کیونکر ممکن ھے -

۷ - کسی اصول پر عمل کا تعلق انسان کے رویے (Attitude) یا نقطۂ نظر سے ھے اور نقطۂ نظر کا بدلنا کچھ ایسا سھل نہیں - امریکہ میں بچوں کی درسی کتابیں ایسے اسباق سے بھری پڑی ھیں کہ گورے بچے کو کالے بچے سے نفرت نہیں کرنی چاھیے - اس سے مل کر کھیلنا، ساتھ ساتھ پڑھنا اور مل جل کر کھانا پینا اچھی بات ھے لیکن سالہا سال کی تدریس کے باوجود گورے بچوں کے نقطۂ نظر میں مشکل ھی سے کوئی تبدیلی آئی ھے اور گورے اور کالے میں تمیز کا احساس بدستور قائم رھتا ھے - بالکل یہی حال ھمارے زیر تربیت استاد کا ھے - جو اساتذہ

بحیثیت غیر تربیت یافتہ استاد ، مدارس میں کام کرنے کے بعد ٹریننگ کالجوں میں داخلہ لیتے ہیں وہ ایک خاص طریقے سے پڑھانے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کی تدریسی عادات اور رویے میں نو دس ماہ کی مختصر مدت کے اندر کوئی انقلاب برپا کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے اور ان نیم پختہ اساتذہ کے رویے کا اثر ان نو آموز طلباء پر بھی ہوتا ہے جو ان کے شانہ بشانہ تربیتی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں -

۸ - ہمارے تربیتی ادارے عام مدارس کی کیفیات کا پوری طرح سے احاطہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں - وہ ایک مخصوص Setting اور Controlled Environment میں طریقہ ہائے تدریس کو آزمانے کا تجربہ کراتے ہیں - جب عام مدارس میں استاد کو وہ مخصوص Setting میسر نہیں آتی تو وہ ان طریقہ ہائے تدریس کو ناممکن العمل سمجھ کر خیر باد کہہ دیتا ہے - ہمارے مدارس میں طلباء کا ہجوم اور تدریسی سہولتوں کا فقدان بے حد حوصلہ شکن عوامل ہیں - جبکہ ٹریننگ کالج میں استاد دوران تربیت بالعموم پچیس تیس طلباء کو ایک سبق پڑھانے کے لیے کئی دن تک تیاری کرتا ہے - اسی استاد کو مدرسے میں جا کر روزانہ لگاتار چھ سات پیریڈ پڑھانا پڑتے ہیں اور کسی جماعت میں بھی طلباء کی تعداد ستر سے کم نہیں ہوتی - مزید برآں تربیتی ادارے عموماً شہروں میں قائم ہیں اور شہری طلباء کے مسائل سے کسی حد تک روشناس ہیں لیکن وہ دیہات کے مخصوص مسائل ، لب و لہجہ کی دقتوں ، قوت اظہار کی کمزوری اور وسائل تدریس کی کمیابی سے کماحقہ واقف نہیں ہوتے اور نہ وہ اپنے طلباء ہی کو ان مسائل سے دوچار ہونے کے لیے تیار کر سکتے ہیں - ایسے حالات میں اصول اور کارکردگی میں تفاوت کی موجودگی ناگزیر ہے -

۹ - ہمارے مدرسے وہ "کان نمک" ہیں کہ جو نیا استاد اس میں داخل ہوتا ہے نمک ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے - وہی اوصاف ، وہی خصائل .... تربیت گاہ سے نکل کر اگر کوئی استاد جدید نظریات تعلیم کے بارے میں ایک نیا عزم اور ولولہ لے کر مدرسے میں

داخل ہوتا ہے اور بچوں کو جدید طریقوں سے پڑھانے کا عہد کرتا ہے تو جلد ہی رفقائے کار کے تمسخر کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ مجبوراً انہی بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کو اپنے لیے باعث نجات خیال کرتا ہے۔ آخر کون ایسا دیوانہ ہے جو جدید طریقہ ہائے تدریس کو مدارس میں نافذ کرنے کے لیے سر مارے اور تحسین و آفرین کے بجائے نفرین کا سزا وار بنے۔ جلد ہی اسے یہ سبق پڑھا دیا جاتا ہے کہ میاں کام اتنا کرو جتنے پیسے ملتے ہیں۔ خدا بھلا کرے اس ''صاحب دل'' مگر تنگ نظر استاد کا جس نے یہ کہا تھا کہ جناب تیس روپے میں تو ''گرل'' کو ''گرل'' ہی پڑھاؤں گا۔ اگر ہمارے اساتذہ میں علم کی خرید و فروخت کا یہی تصور کار فرما رہا تو یہ تضاد کیونکر ختم ہوگا۔

۱۰۔ ایک اور بات جو تدریس کے نظریات اور عمل کی خلیج کو وسیع کرنے کی ذمہ دار ہے وہ اساتذہ کے لیے مناسب رہنمائی کا فقدان ہے۔ تربیت گاہ سے نکلنے کے بعد استاد کا تربیت گاہ سے رابطہ عملاً ختم ہو جاتا ہے۔ نہ وہ کبھی اس تربیت گاہ میں واپس بلایا جاتا ہے نہ تربیت گاہ کا استاد کبھی اس کے پاس یہ دیکھنے کے لیے جاتا ہے کہ وہ کس حال میں ہے؟ کیا پڑھا رہا ہے؟ کیسے پڑھا رہا ہے؟ اسے تدریس کی راہ میں کن کن مشکلات کا سامنا ہے اور انہیں کیونکر دور کیا جا سکتا ہے؟ گویا تربیت کے بعد استاد کو اس کے اپنے حال اور زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ سعی و خطا (Trial and Error) کے طریقے سے جو کچھ سیکھ سکتا ہے، سیکھ لیتا ہے۔ تربیتی اداروں کی عام مدارس سے یہ لاتعلقی اس خلیج کو پاٹنے کی راہ میں بری طرح سے حائل ہے۔ اگر استاد کو اپنے افسران معائنہ اور ہیڈ ماسٹر سے اس میدان میں مناسب رہنمائی دستیاب ہو سکتی تو اس کے صحیح تدریسی راہوں سے بھٹک جانے کے امکانات کم ہوتے لیکن افسوس کہ اسے یہ بھی میسر نہیں۔ افسران معائنہ وہ جو الا ماشاء اللہ خود جدید نظریات تعلیم سے ناواقف اور تعداد میں اس قدر کم کہ ان کو ثانوی مدرسے کے ایک استاد کے کام کو جانچنے کا تین سال میں بمشکل ایک موقع ملتا ہے۔ مغربی ممالک میں اساتذہ کی امداد اور

رہنمائی کے لیے ایک کثیر تعداد میں مشیر (Consultants) اور نگران (Supervisors) موجود ہوتے ہیں - یہاں سرے سے اس قسم کی کوئی سہولت میسر نہیں - ہمارے مدارس میں ایک عام استاد اتنا بیدار مغز بھی نہیں ہوتا کہ وہ از خود اپنی تدریس کو بہتر بنانے کے لیے اکابر تعلیم سے ملاقات کا خواہاں اور وسائل تدریس کا جویا رہے اور پھر اس قسم کی تلاش کی اگر حوصلہ افزائی بھی نہ ہو تو استاد کے جوش اور جذبے کا افسردہ ہو جانا موجب حیرت نہیں -

دوران ملازمت پیشہ ورانہ قابلیت کو بڑھانے کے لیے ناکافی سہولتیں اس خلیج کو اور وسیع کر دینے کی ذمہ دار ہیں - اس وقت مغربی پاکستان کے دو ہزار ثانوی مدارس کے اساتذہ کو دوران ملازمت تربیت دینے کے لیے کل چار مراکز اور تیس اساتذہ ہیں - ان تیس اساتذہ کو ثانوی مدارس کے چالیس ہزار اساتذہ سے جو نسبت ہے وہ اظہر من الشمس ہے -

۱۱ - اس خلیج کو وسیع کرنے میں محکمہ تعلیم کی انتظامیہ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں - تقرر اور تبادلے میں عموماً استاد کی خصوصی مہارت اور مدرسے کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے - بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ریاضی کے استاد کی جگہ معاشرتی علوم کا استاد ، عربی کی اسامی پر فارسی کا استاد بھیج دیا جاتا ہے - ظاہر ہے کہ جس استاد نے متعلقہ مضمون پڑھا ہی نہیں یا اس کی تدریس کی مہارت ہی سے بے بہرہ ہے ، وہ صحیح طریقۂ تدریس کیونکر اختیار کر سکتا ہے - اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایک گورنمنٹ سکول میں ڈرائنگ ماسٹر کی اسامی پر ایک منشی فاضل گریجوایٹ کو متعین کر دیا گیا - محض اس لیے کہ وہ زائد العمر ہو رہا تھا اور اسے بہرحال اسامی مہیا کرنی تھی -

نظریہ اور عمل میں تضاد کے اسباب اور بھی ہیں لیکن بخوف طوالت انہی چند نکات پر اکتفا کرتا ہوں اور ایسی تجاویز پیش کرتا ہوں جن سے اس تضاد کو کم کیا جا سکے -

۱ - تربیتی اداروں کے نصاب اور طریقہ ہائے تدریس پر نظر ثانی

کی جائے اور زیر تربیت اساتذہ کو صرف ایسے نظریات اور طریقوں کی تعلیم دی جائے جو ہمارے حالات میں پوری طرح قابل عمل ہوں۔

۲۔ مدارس کی حالت کو سدھارا جائے۔ طلباء کی تعداد پر کنٹرول کیا جائے، تدریسی سہولتیں مہیا کی جائیں اور اساتذہ پر تدریس کا بوجھ کم کیا جائے تاکہ وہ مدرسے کے فارغ اوقات میں اپنے اسباق کے لیے تدریسی اعانات فراہم کر سکیں۔

۳۔ تربیتی اداروں اور مدارس کے تعلق کو مضبوط کیا جائے۔ افسران معائنہ کے انتخاب میں تربیتی اداروں کے اساتذہ کو ترجیح دی جائے بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ ایسی اسامیوں پر تقرر کے لیے تربیتی ادارے میں پڑھانے کا تجربہ لازمی شرط قرار دیا جائے۔ تربیتی اداروں کے اساتذہ کو سہولت بہم پہنچائی جائے کہ وہ سال میں کم از کم دو ماہ ایسے مدارس میں گزاریں جہاں ان کے پڑھائے ہوئے استاد کام کر رہے ہیں تاکہ وہ ان کے کام کی نگرانی اور ان کے مسائل کے حل میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔

۴۔ افسران معائنہ کی تعداد میں معقول اضافہ کیا جائے۔ ہر بیس ابتدائی مدارس اور ہر پانچ ثانوی مدارس کے لیے ایک افسر معائنہ ہو۔ اس کے علاوہ مشیر بھی مقرر کیے جائیں۔ معائنہ کا پرانا تصور یکسر بدل دینے کے قابل ہے۔ اکثر ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ طریق معائنہ انتہائی غیر تسلی بخش ہے اور اس سے استاد اور مدرسے کو شاید ہی کچھ فائدہ پہنچتا ہو۔

۵۔ دوران ملازمت تربیت کے پروگرام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس کے پروگراموں کو اتنا وسیع کر دیا جائے کہ ہر استاد تین سال میں کم از کم ایک مرتبہ تجدیدی کورس میں شامل ہو سکے۔ ترقی کا دارومدار ان

کورسوں میں شمولیت پر ہو۔ اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے باتنخواہ رخصت کی سہولت بھی دی جائے۔

٦۔ اساتذہ کو صحیح قیادت مہیا کرنے کے لیے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور افسران نظارت کی ٹریننگ کے خاص انتظامات کیے جائیں تاکہ وہ نئے اساتذہ کو جدید طریقہ ہائے تعلیم سے پڑھاتے دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی اور اس میدان میں مزید رہنمائی کر سکیں۔

٧۔ اساتذہ کو پیشہ ورانہ کتابیں اور رسالے مہیا کیے جائیں۔ اساتذہ کے لیے اپنی زبان میں درجہ وار اور مضمون وار تعلیمی رسالے شائع کیے جائیں۔

٨۔ تمام اساتذہ کو ایک ایسے پروفیشنل ادارے کا رکن بنایا جائے جس کی رکنیت سے ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں ابھریں اور انہیں اپنے تدریسی مسائل حل کرنے میں مدد مل سکے اور جہاں وہ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہو سکیں۔

٩۔ اساتذہ کے لیے ایک ایسا ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے جس میں ہر استاد سے حلف لیا جائے کہ وہ صحیح طریقہ ہائے تدریس کو کام میں لائے گا اور ان مقاصد تعلیم کو پورا کرنے کی سعی کرے گا جو اس ضابطے کی کتاب میں درج ہونگے۔

١٠۔ اساتذہ کو اتنی معقول تنخواہیں دی جائیں کہ وہ عصر حاضر کے مادی تقاضوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو سکیں اور وہ دوسرے ضمنی کاموں سے بے نیاز ہو کر تدریس کے فرائض کو پورے انہاک اور توجہ سے انجام دے سکیں۔

١١۔ اساتذہ کے معیار تربیت کو بہتر بنانے کے لیے ایف۔ اے، ایف۔ایس سی کے طلباء کے لیے تین سالہ اور چار سالہ تربیتی کورس نافذ کیا جائے۔ تربیت کے پرائیویٹ امتحانات پر پابندی لگائی جائے کیونکہ اس کی اجازت دینا گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ اچھا استاد بننے کے لیے تربیت حاصل کرنا

اہم نہیں بلکہ امتحان میں پاس ہو جانا کافی ہے۔ دوران تربیت عملی تدریس پر مزید زور دیا جائے۔ ٹریننگ کالجوں میں طلباء کی تدریس کی نگرانی پر صرف ایسے پروفیسروں کو مامور کیا جائے جو فن تدریس میں خدا داد صلاحیت، وسعت تجربہ اور جدت افکار کی دولت سے مالا مال ہوں۔ عملی تربیت کے لیے اساتذہ کو دیہاتی مدارس میں بھی بھیجا جائے تاکہ وہ وہاں کے حالات اور مسائل کے مطابق اپنی تدریس کو ڈھال سکیں۔

۱۲ - نظام امتحانات میں مناسب تبدیلیاں لائی جائیں تاکہ طلباء کی قوت حافظہ کے ساتھ ساتھ ان کی سمجھ بوجھ، ذہانت، پختگیٔ فکر اور وسعت مطالعہ کو بھی جانچا جا سکے۔

۱۳ - اچھے اساتذہ کی پرکھ اور تحسین کے لیے نئے معیار مقرر کیے جائیں اور ہر سال ہر درسگاہ کے اساتذہ کی کارکردگی کی بنا پر بہترین استاد کا انتخاب کیا جائے اور اسے مدرسے، مقامی لوگوں، مقامی انتظامیہ اور حکومت کی طرف سے انعامات اور اعزازات عطا کیے جائیں۔

۱۴ - مدارس کے سربراہوں کے انتخاب میں محض قدامت ملازمت کا اصول نظم و نسق اور تدریس کے جدید نظریات کے منافی ہے۔ کسی مدرسے کا ایسا سربراہ جو جدید نظریات تعلیم سے روشناس نہ ہو اور ان کی اہمیت اور افادیت میں ایمان نہ رکھتا ہو اور نہ ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے اور مدرسہ کا نظم و نسق چلانے کی صلاحیت رکھتا ہو، ہرگز اچھا سربراہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ مناسب ہوگا کہ سربراہ مدرسہ کے انتخاب میں قدامت ملازمت کے ساتھ ساتھ ذاتی اور پیشہ ورانہ خصوصیات کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

---

# سمعی و بصری
# اعانتوں کی اہمیت

آج سے تقریباً تین سو برس پہلے کومینیس ( Johann Amos Comenius 1592-1670 A.D.) نے کہا تھا بچہ اشیاء کے براہ راست تعارف اور تجربے (Direct Association and Experiences) کے ذریعے جو کچھ سیکھتا ہے وہ زیادہ دیرپا اور مؤثر ہوتا ہے۔ اس لیے استاد کو چاہیے کہ اپنی تدریس کی بنیاد بچوں کے بلا واسطہ تجربات پر رکھے۔ جہاں اصل اشیاء کا بلا واسطہ تجربہ ممکن نہ ہو وہاں یہ تجربہ اصل اشیاء کی تصاویر کے ذریعے بہم پہنچایا جائے۔[1]

کومینیس (Comenius) سے پہلے درسی کتابوں میں تصاویر و توضیحات کا رواج نہ تھا۔ یہ پہلا ماہر تعلیم ہے جس نے لاطینی کی درسی کتابوں میں ورق ورق پر تصاویر شامل کیں۔ باتصویر کتب (Orbis Pictus) کا یہ سلسلہ اپنی دوسری خوبیوں کے علاوہ، تصاویر کے باعث اس حد تک مقبول ہوا کہ ایک مدت تک یورپی مدارس میں رائج رہا۔ تصاویر و توضیحات کے شمول سے ایک طرف تو کتابیں جاذب توجہ ہو گئیں اور دوسری طرف الفاظ و فقرات زیادہ بامعنی اور مقرون نظر آنے لگے۔ عبارتوں کی تفہیم آسان ہو گئی اور اساتذہ کے کام کی افادیت بڑھ گئی۔

درسی کتابوں کو باتصویر بنانے میں کومینیس کی یہ کوشش اس حد تک کامیاب رہی کہ بعد میں آنے والی نسلوں نے اس کا تتبع ضروری سمجھا اور آج اس روش کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر کہ و مہ باتصویر کتابوں کا رسیا نظر آتا ہے۔ ہماری نگاہیں سب سے پہلے تصاویر

---

1. R. Freeman Butts : *A Cultural History of Western Education*, New York, McGraw-Hill Book Company, Inc., 1955, pp. 236-239.

ہی پر رکھتی ہیں ۔ ایسی درسی کتابیں جو تصاویر سے معرا اور توضیحات سے خالی ہوں ، طلباء میں مقبول ہوتی ہیں نہ اساتذہ میں ۔ گویا اعانت بصری کی جو شمع تین صدی قبل کومینیس نے روشن کی تھی وہ مرور ایام کے ساتھ اور زیادہ منور ہوتی گئی اور آج اس کی ضیاپاشیوں سے تعلیم و تدریس کی پوری دنیا جگمگ جگمگ کر رہی ہے ۔ کسی زمانے میں تصویر ہی واحد بصری امداد سمجھی جاتی تھی لیکن اب اس کی ہیئت ، اس کی نوعیت اور شکل و صورت میں نہایت گراں قدر اضافے ہو چکے ہیں ۔ ساکت و جامد تصاویر ، حرکت آشنا اور صدا شناس ہو گئی ہیں اور ان کی جدید ترین صورت ، ٹیلی ویژن کے روپ میں جلوہ گر ہے ۔ بصری اعانات کے علاوہ بہت سی سمعی اعانتیں بھی دریافت کی جا چکی ہیں ۔ آجکل گراموفون ، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر مؤثر آلات تدریس کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ زبانوں کی تدریس کو بہتر بنانے کے لیے حال ہی میں جو لسانی تجربہ گاہیں (Language Laboratories) وجود میں آئی ہیں وہ انہی اعانتوں پر مشتمل ہیں ۔ اخذ و اظہار کو سہل اور مؤثر بنانے ، اور ابلاغ ( Communication ) کو وضاحت سے ہم آہنگ کرنے میں ، ان اعانتوں کی افادیت مسلم ہے اور اسی وجہ سے یہ اعانتیں نہ صرف ایک اچھے تعلیمی ادارے کا جزو لاینفک ہیں ، بلکہ فوجی اور کاروباری اداروں میں بھی ان کا استعمال ناگزیر سمجھا جاتا ہے ۔

### سمعی و بصری اعانتوں سے کیا مراد ہے ؟

کیا سمعی و بصری اعانتوں سے ایسی تدابیر مراد ہیں جو بچوں کے سمعی و بصری تصورات کو پختگی عطا کرنے میں مدد دیں ؟ کیا ان سے مراد ایسی امدادیں ہیں جو عمل تدریس کو زیادہ سہل اور زیادہ خوشگوار بنانے میں معاون ہوں ؟ کیا ہر وہ چیز جو مجرد تصورات کو مقرون بنا دے ، جو مبہم خیالات کو وضاحت سے ہمکنار کر دے ، جو پیچیدہ افکار کو سلجھا دے ، سمعی و بصری اعانت کے زمرے میں شامل ہو گی ؟ بلاشبہ ان جملہ استفسارات کا جواب اثبات میں ہے ، سمعی و بصری اعانتیں اظہار و ابلاغ کے وسائل کی حیثیت رکھتی

هیں - جب کبھی کوئی تصور (Concept) ، کوئی خیال (Idea) یا کوئی حقیقت ( Fact ) قاری یا سامع کے ذہن میں منتقل کرنا مقصود ہو تو ہمیں کوئی وسیلہ یا سہارا تلاش کرنا پڑتا ہے - ماتھے کے بل ، چہرے کی رنگت ، آنکھوں کی پتلیوں کی حرکت ، اشارات ، جسمانی حرکات و سکنات وغیرہ ، اظہار جذبات اور ابلاغ خیالات کے خاموش وسیلے ہیں - جب ہم اپنا ما فی الضمیر اس طرح بیان نہیں کر سکتے ، تو زبان کا سہارا لیتے ہیں - لیکن بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ محض زبان سے بات نہیں بنتی- خیال کی وضاحت ، تصاویر ، نقشہ جات اور توضیحات کی محتاج ہوتی ہے - یہی وہ مقام ہے جہاں ایک کامیاب استاد خیال کی مناسبت سے ، موزوں اعانتوں کو بروئے کار لا کر سبق کے تاثر اور افادیت میں قابل قدر اضافہ کر سکتا ہے -

عمل تدریس کا دار و مدار عمل ابلاغ (Process of Communication) پر ہے ، بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ تدریس ، ابلاغ ہی سے عبارت ہے - ابلاغ جس قدر مؤثر ہو گا ، تدریس اتنی ہی زیادہ جاندار ہو گی اور تحصیل اسی قدر پختہ - ابلاغ کا تاثر دو باتوں پر موقوف ہے - ایک وضاحت اظہار پر اور دوسرے متکلم اور سامع ، یا مصنف اور قاری کی باھمی افہام و تفہیم اور عمل ابلاغ میں پرخلوص شرکت پر[2] - ان میں سے ایک بھی مفقود ہو تو تاثر جاتا رہتا ہے - سمعی و بصری اعانتیں اظہار کو وضاحت سے ھمکنار کرتی اور باھمی افہام و تفہیم کی ضمانت دیتی ہیں - کلاس میں ان کے استعمال سے نہ تفریح مقصود ہوتی ہے ، نہ تفنن طبع ، بلکہ استاد کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ مجرد تصورات اور مشکل خیالات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ طلباء انہیں بہ رضا و رغبت قبول کر لیں-

سمعی و بصری اعانتوں کی اصطلاح بظاھر صرف انہی وسائل و اعانات تک محدود ہونی چاہیے جن کا تعلق سننے یا دیکھنے سے ہے ، لیکن تعلیمی دنیا میں اس اصطلاح کا اطلاق ہر اس تدبیر اور وسیلے پر

2. Edgar Dale: *Audio-Visual Methods in Teaching*, New York. The Dryden Press, 1957, pp. 3-6.

ہوتا ہے جو اشیاء اور حقائق کے براہ راست تجربہ کرنے یا کسی خیال کو وضاحت سے ہم آہنگ کرنے میں معاون ہو۔ قوت سامعہ اور قوت باصرہ یقینی طور پر تحصیل علم کے دو بڑے دروازے ہیں، لیکن بہت سے ایسے تجربات ہیں جو دیگر حواس کے ذریعے ہی ممکن ہیں۔ مثلاً نرمی و سختی، سردی و گرمی اور شیرینی و تلخی وغیرہ۔ ایسے تجربات کا حصول نہ آنکھ سے ممکن ہے، نہ کان سے۔ اس لیے کلاس میں ایسی تمام اعانتوں کا شمار، جن کا تعلق جملہ حواس خمسہ سے ہو، سمعی و بصری اعانات ہی میں ہو گا۔

**سمعی و بصری اعانتوں کے استعمال کی ضرورت اور اہمیت :**

(۱) قدرت نے بنی نوع انسان کو حواس خمسہ عطا کیے ہیں۔ یہ حواس علم کے دروازے ہیں۔ ایسی تدریس جس میں مخاطب کے زیادہ سے زیادہ حواس کو اپیل کی جا سکے اس تدریس سے یقیناً زیادہ مؤثر ہو گی، جس کا محور محض قوت سامعہ ہو۔ وہ معلم جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ مطلوبہ تجربات، خیالات اور تاثرات کو محض کان کے راستے بچوں کے ذہنوں میں منتقل کر سکتا ہے، وہ یہ نہیں جانتا کہ جو مواد وہ ان کے ایک کان میں انڈیلتا ہے، وہ دوسرے کان کے راستے باہر نکل جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر تصورات اس وقت تک پختہ نہیں ہوتے جب تک انہیں ذہن تک پہنچنے والی مختلف راہوں سے نہ گزارا جائے۔ تدریس میں ان اعانتوں کے استعمال کا جواز اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ اعانتیں مختلف مواقع پر مناسب حواس کو کام میں لانے کا سامان فراہم کرتی ہیں اور اس طرح مجرد سے مجرد تصورات واضح ہو جاتے ہیں اور ان پر ذہن کی گرفت زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔

(۲) طلباء کے انفرادی اختلافات ایک مسلمہ نفسیاتی حقیقت رکھتے ہیں۔ بچے جس طرح شکل و صورت، عادات و اطوار، جذبات و احساسات، مزاج و نظریات میں مختلف ہوتے ہیں اسی طرح وہ ذہانت، استعداد تحصیل اور پختگی حواس میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اختلافات بچوں کے انداز تحصیل اور اساتذہ کے طریق تدریس کو

متعین کرنے میں مدد دیتے ھیں ۔ بعض بچوں کے لیے کسی لفظ یا کسی چیز کا محض سمعی تصور کافی ھو سکتا ھے ، لیکن دوسرے بہت سے بچے اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ سمعی تصور پر بصری تصور کا غلاف نہ چڑھا دیا جائے ۔ اسی طرح بعض بچے جب تک کسی لفظ کو لکھ نہ لیں یاد نہیں رکھ سکتے ۔ گویا وہ کان یا آنکھ کے مقابلے میں پٹھوں اور نسوں کے استعمال سے کچھ زیادہ اچھی طرح سیکھ لیتے ھیں ۔ ایسے بچے جنہیں Kinesthetic کہا جاتا ھے ، عام تدریس سے ، جس میں معلم کی حیثیت ایک متکلم کی سی ھوتی ھے ، بہت کم فیض یاب ھوتے ھیں ۔

بچوں کے انفرادی اختلافات سے قطع نظر ایک ھی بچہ مختلف اوقات میں مختلف طریقوں اور وسیلوں سے سیکھتا ھے ۔ کبھی وہ اس موڈ میں ھوتا ھے کہ محض سن کر سیکھ لیتا ھے اور کبھی وہ حقائق کا براہ راست تجربہ کیے بغیر آگے نہیں چلتا ۔ بچے کی اس ذھنی کیفیت میں اس کے خارجی ماحول اور اس کے داخلی مزاج کو بڑا دخل ھوتا ھے ۔ اس لیے وہ استاد جو اپنے ترکش میں صرف ایک ھی قسم کے تیر رکھتا ھو ، عمل تدریس میں اکثر ناکام رھتا ھے ۔ بچوں کے انفرادی اختلافات اس بات کے مقتضی ھیں کہ معلم متنوع اقسام کی سمعی و بصری اعانتوں سے لیس ھو ۔

(۳) جس طرح طلباء تحصیل و تعلم کی صلاحیتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ھوتے ھیں اسی طرح اساتذہ بھی تدریسی قابلیتوں میں یکساں نہیں ھوتے ۔ بعض استاد اپنی قادر الکلامی اور لسانی پختگی کے سہارے بہت سے مجرد تصورات کو واضح کرنے میں کامیاب ھو جاتے ھیں ۔ لیکن اول تو ایسے اساتذہ کی تعداد بہت کم ھے ، دوسرے تدریس کے ھر مرحلے میں صرف زبانی توضیحات کام نہیں دے سکتیں ۔ ھمارے یہاں کثرت ایسے اساتذہ کی ھے جو زبان و بیان پر مناسب قدرت نہ رکھنے کے باوجود صرف گفتگو پر تکیہ کرتے ھیں ۔ ایسے اساتذہ اگر سمعی و بصری اعانتوں کے گراں بہا ذخیرے کی طرف توجہ فرمائیں ، تو یقیناً ان کی تدریس کا حسن اور تاثر دوبالا ھو سکتا ھے ۔

تدریسی اعانتیں ہر استاد کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور جلا دینے کی خصوصیت رکھتی ہیں ۔

(۴) تعلیم کے بے شمار شعبے ہیں اور ہر شعبے میں بیسیوں مضامین اور فنون ۔ ہر مضمون اور ہر فن میں روز بروز نت نئے مسائل اور گونا گوں تصورات کا اضافہ ہو رہا ہے اور علمی تخلیقات کے انبار لگ رہے ہیں ۔ وہ علم جس میں کبھی صدیوں کے بعد کوئی اضافہ ہوتا تھا اب وہ ہر دس برس کے بعد دگنا ہو جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ہم اس علمی انفجار (Knowledge Explosion) کے آگے آبادی کے انفجار (Population Explosion) کی طرح بند باندھنے کا کوئی منصوبہ سوچ بھی نہیں سکتے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی ضروری سمجھتے ہیں ۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم حتی الوسع وسائل تعلیم کو ترقی دیں اور طریقہ ہائے تعلیم میں جدتیں پیدا کریں تاکہ ہمارے سیکھنے اور پڑھنے کی رفتار تیز ہو سکے اور مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیا جا سکے ۔ نئے ریاضیاتی تصورات ، جدید سائنسی معلومات اور علمی انکشافات کی تفہیم صرف کتابوں کے ذریعے ممکن نہیں ۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ریاضی ، طبیعیات ، کیمیا ، نباتیات اور حیوانیات کے نصاب میں حالیہ ترامیم کے پیش نظر ، جب نئی درسی کتابیں لکھی گئیں تو کتابوں کے ساتھ ساتھ سمعی و بصری اعانتیں بھی تیار کر دی گئیں تاکہ نئے تصورات جو محض کتاب کے الفاظ اور توضیحات سے واضح نہیں ہوتے وہ سلائیڈوں ، فلموں اور دوسری تدریسی اعانتوں سے واضح ہو جائیں ۔

(۵) ہمارا زمانہ ، سائنس اور تکنالوجی کا زمانہ ہے ۔ مشینوں کی ایجادات نے زندگی میں ایک ہلچل مچا رکھی ہے ۔ آج انسانی زندگی کا ہر پہلو اور ہر شعبہ اس سے متاثر ہے ۔ زراعت ، صنعت ، دفاع ، آمد و رفت ، غرض کہ جس میدان میں نکل جائیں مشین کی حکومت نظر آئے گی ۔ ٹریکٹر نے لکڑی کے ہل کی جگہ لے لی ہے ۔ انسان بیل گاڑی سے ہوائی جہاز تک جا پہنچا ہے اور خلائی تسخیر کی راہوں پر گامزن ہے ۔ چھوٹی دستکاریاں بڑے بڑے صنعتی اداروں کی چوکھٹ پر دم توڑ رہی ہیں ۔ اگر ان مشینوں کی ایجاد بالخصوص خودکار مشینوں

(Automation) کے معرض وجود میں آنے سے کارکن طبقہ خاصا متاثر ہوا ہے، لیکن اس سے پیداوار کی شرح ، اور اسی رفتار سے دولت میں اضافے کی شرح ، بہت بڑھ گئی ہے ۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس بھرپور حملے سے اگر کوئی شعبہ محفوظ ہے تو وہ تعلیم کا ہے ، جہاں آج بھی استاد بیل گاڑی کے زمانے کے طریقوں سے پڑھاتے ہیں ، جہاں اب بھی طریقہ ہائے تعلیم میں جدتوں (Innovations) کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جاتا ۔ البتہ بعض ممالک میں ماہرین تعلیم نے جدید تکنیکی تدابیر اور تدریسی مشینیں (Teaching Machines) ایجاد کر لی ہیں ۔ پروگرامی نصاب ، سمعی و بصری اعانتیں ، ٹیلی ویژن اور حال ہی میں کمپیوٹر (Computor) کے ذریعے تعلیم ، دنیائے تدریس میں ٹکنالوجی کے استعمال کی چند مثالیں ہیں ۔

(٦) مشینوں کی ایجاد سے انسان کی سماجی زندگی بھی متاثر ہوئی ہے ۔ چنانچہ کئی معاشری مسائل پیدا ہو گئے ہیں ۔ مثلاً شہری آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے ۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق آئندہ بیس برس میں دنیا کی شہری آبادی دگنی ہو جائے گی ۔ ہمارے ملک کی شہری آبادی میں اضافے کی رفتار معمول سے بہت زیادہ ہے ۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک شہری آبادی میں اضافے کی شرح ۴ء۵٦ فی صد رہی ہے جبکہ دیہاتی آبادی میں صرف ۸ء۱۹ فی صد شرح سے اضافہ ہوا ۔ اور کل آبادی میں اضافے کی شرح ٦ء۲۳ فی صد رہی[1] ۔ شہری آبادی میں اس غیر معمولی توسیع سے ہمارے شہری مدرسے ، براہ رست متاثر ہوئے ہیں ۔ کثرت طلباء نے روایتی طریق تدریس کو ، جس میں استاد محض گفتگو اور تقریر سے بچوں کو متاثر کر لیتا تھا ، ناکام بنا دیا ہے ۔ موجودہ صورت حال کا تقاضا ہے کہ استاد نئے وسائل تعلیم کو بروئے کار لائے ۔ فلموں ، ریڈیو ، ٹیلی ویژن اور تعلیم بذریعہ پروگرام (Programmed Text-books) کی افادیت کو پرکھا جائے اور ان جدید طریقہ ہائے تعلیم کو حسب ضرورت اپنا لیا جائے ۔

---

1. Nazir Ahmad, Lt. Col., *Population in Pakistan*, Karachi, (1) Govt. of Pakistan, Department of Films & Publications, 1965, p. 9.

(۷) آج کل ہمارے ملک میں تعلیمی ضیاع کا رونا گھر گھر ہے ۔ تعلیم کی ہر سطح پر طلباء کی ایک کثیر تعداد تعلیم کو خیرباد کہہ دیتی ہے ۔ تعلیم کو بیچ میں چھوڑ دینے والے طلباء کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے ۔ لیکن یہ مسئلہ صرف ہمارا ہی مسئلہ نہیں ، دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک بھی اسی مسئلے سے دوچار ہیں ۔ حال ہی میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس موضوع پر کئی تحقیقی مطالعے کیے گئے جو اس بات پر متفق ہیں کہ اس صورت حال کی ایک بڑی وجہ غیر مؤثر تدریس ہے ۔ انہی مطالعوں نے اس بات کی نشاندھی بھی کی ہے کہ جن مدارس میں سمعی و بصری اعانتوں سے مصرف لیا جاتا ہے ، ان میں تعلیم سے بھاگنے والے بچوں کی شرح نسبتاً بہت کم ہے ۔ اسی مشاھدے کی بناء پر محققین نے سفارش کی ہے کہ مدرسوں میں سمعی و بصری اعانات کے پروگرام کو بہتر اور بامقصد بنایا جائے ۔[1]

(۸) تنوع ، تزئین حیات کا دوسرا نام ہے ۔ یہ نہ ہو تو زندگی بے کیف ہو جائے اور دنیا سپاٹ نظر آنے لگے ۔ یہی تنوع تدریس کو نمو بخشتا ہے اور تعلیم کو حیات نو عطا کرتا ہے ۔ پڑھانے کا ایک ہی انداز ، سمجھانے کا ایک ہی طریقہ ، تدریس کا ایک ہی وسیلہ ، تعلیم کی بالیدگی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے ۔ سمعی و بصری اعانتیں تعلیم کو نت نئی راہوں سے آشنا کرتی ہیں اور ان راستوں میں رنگ رنگ کے پھول بکھیرتی ہیں ۔

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ تعلیم و تدریس میں سمعی و بصری اعانتوں کا استعمال نہایت ضروری ہے ۔ ان کی افادیت کے متعلق جتنے تحقیقی مطالعے ہوئے ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ تدریسی اعانتوں کی بدولت طلباء کے لیے عمل تدریس مؤثر و خوشگوار ہو جاتا ہے ۔

---

1. Loyd B. Urdal Etal : *Why School Drop-out : an Analysis of. Personal Variables within the School Situation*, Olympia, Wash : State Superintendent of Public Instruction, 1963.

# جسمانی سزا۔ایک تاریخی جائزہ

تاریخ التعلیم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جب ہم مشرق و مغرب کے مختلف تعلیمی ادوار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تقریباً ہر دور میں ابتدائی تعلیم اور جسمانی سزا لازم و ملزوم کی حیثیت سے موجود رہے ہیں ۔ سزا کے بارے میں قدیم ترین نظریہ یہ ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں پورا تعلیمی عمل ادھورا بلکہ بے کار رہتا ہے ۔ طلباء میں نظم قائم رکھنے ، درسگاہ کو کامیابی سے چلانے اور بچوں کو کامرانی سے ہمکنار کرنے کے لیے تشدد اور مار پیٹ ضروری ہیں ۔ ابتدائی ازمنہ تاریخ کے بارے میں جو معلومات ہمیں حاصل ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ طالب علموں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں ۔ بید کا بے تحاشا اور آزادانہ استعمال ہوتا تھا اور سزا کو محرک ذہنی اور وسیلۂ تعلیم سمجھا جاتا تھا ۔

قدیم یونان اور سپارٹا میں رائج نظام تعلیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بھی طلباء پر ڈنڈے برسانا اور انہیں جسمانی سزا دینا اس لیے جائز بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ اس سے متعلمین میں فرمانبرداری کا جوہر پیدا ہوتا ہے اور ان کے اجسام مستقبل کے مصائب برداشت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔

روما کے نظام تعلیم میں بھی تشدد اور جسمانی سزا کا یہی رجحان ملتا ہے ۔ البتہ اس دور میں ہمیں ایک ایسا مفکر تعلیم نظر آتا ہے جو جسمانی سزا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور اساتذۂ وقت کو یہ مفید مشورہ دیتا ہے کہ بچوں کو مارنے پیٹنے کی بجائے اگر ان میں صحت مندانہ مقابلے کے جذبہ کو بیدار کر دیا جائے اور انہیں انعامات کا لالچ دیا جائے تو اس سے ان کے تعلیمی شوق کو جلا دی جا سکتی ہے اور مدرسہ کے نظم کو بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے ۔ اس

مفکر اور ماہر تعلیم کا نام کوئنٹلین (Quintilian) تھا - یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اساتذہ کی توجہ متعلمین کے انفرادی اختلافات کی طرف دلائی اور انہیں یہ بتلایا کہ ہم طلباء کے مذاق اور ان کی ذہنی استعداد کے مطابق انہیں تعلیمی مضامین میں انتخاب کا حق دے کر ان کی دلچسپی کو قائم رکھ سکتے ہیں اور انہیں مار پیٹ سے بھی بچا سکتے ہیں - اس ماہر تعلیم نے جسمانی سزا کے مقابلے میں کھیل کود اور تفریحی مشاغل کی تعلیمی اہمیت اور ان کے فوائد پر روشنی ڈالی لیکن ان نظریات کے باوجود ہمیں سلطنت روما کے ابتدائی مدارس میں یہی نظر آتا ہے کہ وہاں عملاً وہی نظم کارفرما تھا جو انہیں اہل یونان سے ورثے میں ملا تھا اور اس نظم کو سکھانے اور تعلیمی عمل کو آگے بڑھانے کا واحد ذریعہ جسمانی سزا تھی -

زمانہ وسطیٰ میں (چھٹی صدی عیسوی سے گیارھویں صدی عیسوی تک) مغربی ممالک میں جسمانی سزا دینے کے نظریات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی - اس دور میں بھی بیچارے طلباء اساتذہ کے تشدد کا شکار بنے رہے - چونکہ کتابوں کی قلت تھی اس لیے اکثر اسباق بچوں کو زبانی حفظ کرنے پڑتے تھے اور حافظہ اور پیہم مشق کو تعلیمی عمل میں ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی - یاد کی ہوئی چیزوں کو بھول جانا اور حافظہ کی فروگذاشت انسانی فطرت کے عین مطابق ہے - لیکن اس بھول کی سزا ، اس دور میں بہت کڑی تھی اور یادداشت کی ایسی لغزش پر بیچارے بچے بری طرح پٹتے تھے - اس پر مستزاد اس دور کی عیسائیت کے اس نظریے کا فروغ کہ ہر بچہ گنہگار پیدا ہوتا ہے اور گناہ لازمۂ حیات ہے - اس دور کے بچوں اور نوجوانوں میں جذبۂ بغاوت کو جنم دینے اور اسے ابھارنے کا باعث ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کی پوری پود ضدی اور ہٹ دھرم بنتی جاتی تھی - طلباء کے اس جذبے کو کچلنے اور ہٹ دھرمی کو توڑنے کا واحد علاج جسمانی سزا تھا - اس عہد کے مذہبی رہنماؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ جسمانی اور روحانی نظم و ضبط سکھانے کے لیے نوجوانوں کو جسمانی سزا دینا نہایت ضروری ہے -

اس دور کے متوازی ہمیں مشرق میں ایک دوسرا تعلیمی دور نظر آتا ہے جس کا آغاز ہادی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ہوتا ہے۔ وہ نبی ص جو تمام جہانوں اور تمام زمانوں کے لیے رحمت بن کر آیا تھا وہ بچوں اور طالب علموں کے لیے بھی شفقت کا پیغام لایا۔ بچوں کے ساتھ آپ کی محبت اور آپ کے مشفقانہ برتاؤ کے اس قدر واقعات ملتے ہیں کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید بعثت رسول ص کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس دور کے جاہل بدوؤں کو بتایا جائے کہ بچوں اور بچیوں سے کس طرح پیار کیا جاتا ہے۔ اس اسلامی عہد میں بڑے بڑے مفکرین کا جسمانی سزا کے بارے میں نظریہ اہل مغرب سے خاصا مختلف تھا اور اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے طلباء کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آیا جائے۔ البتہ جہاں نرمی اور شفقت سے کام نہ چلے تو ان کی اصلاح کے لیے مناسب سختی و درشتی سے گریز نہ کیا جائے۔

محمد ابن ابی زید نے اپنی کتاب میں جو معلمین و متعلمین کے لیے ہدایات پر مشتمل ہے لکھا ہے کہ اگر بچوں کو زد و کوب کرنے کی ضرورت پڑ ہی جائے تو تین کوڑوں سے زائد ہرگز نہ ماریں۔ روایت ہے کہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے کو اس کے استاد کے حوالے کرتے ہوئے معلم کو جہاں اور بہت سی کام کی ہدایات کیں وہاں یہ نصیحت بھی کی کہ پہلے اپنی صحبت اور نرمی خو سے اس کی اصلاح کرو۔ اگر اس طرح وہ درست ہوتا نظر نہ آئے تو پھر سختی و درشتی ضرور برتو۔

گیارھویں صدی عیسوی میں ہمیں ایک باکمال بزرگ امام غزالی رح جو بیک وقت بہت بڑے مفکر، ماہر تعلیم اور مصلح بلکہ مجدد تھے، نظر آتے ہیں۔ آپ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف احیاء العلوم میں معلم و متعلم کے آداب کا ذکر کیا ہے اور معلم کے دس آداب گنوائے ہیں۔ امام غزالی کے نزدیک سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ معلم اپنے شاگردوں پر شفقت کرے اور ان کو اپنے بیٹوں کے برابر جانے۔ پورے اسلامی عہد میں اس بات پر بڑا زور دیا جاتا رہا ہے کہ شاگرد کے لیے استاد باپ

کی مانند ہے اور معلم پر لازم ہے کہ وہ حتی الامکان بچوں سے نرمی سے پیش آئے اور اگر کہیں جسمانی سزا ناگزیر ہو تو معمولی سزا پر اکتفا کرے۔ طلباء کے ساتھ وحشیانہ سلوک اور بربریت اسلامی اصولوں اور تقاضوں کے سخت منافی ہے۔

اس کے کوئی دو تین صدیاں بعد جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوتا ہے تو جسمانی سزا کے بارے میں تعلیمی نظریات ایک نئی کروٹ لیتے ہیں۔ اس دور میں مفکرین نے اساتذہ کو یہ مشورہ دینا شروع کیا کہ جسمانی سزا کے بوجھ کو کچھ ہلکا کیا جائے اور تشدد سے نظم مدرسہ اور عمل تدریس کو سنبھالا دینے کی بجائے طلباء کے جذبہ افتخار اور جذبہ تقابل سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان جذبات کی تسکین سے وہی کام لیا جائے جو مار پیٹ سے لیا جاتا ہے۔ گویا یہ Quintilian اور امام غزالیؒ کے نظریات کی ایک صدائے بازگشت تھی۔

اسی دور میں ہمیں اسلام کے ایک نامور فرزند اور مفکر اعظم کی شخصیت نظر آتی ہے جسے دنیا ابن خلدون کے نام سے یاد کرتی ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کا یہ مشہور عالم جو ایک بلند پایہ ماہر تعلیم اور مفکر تھا۔ اپنی مشہور اور زندہ جاوید تصنیف مقدمہ ابن خلدون میں بڑے شد و مد کے ساتھ طلباء پر سختی اور تشدد کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ تعلیم میں جسمانی سزا روا رکھنا طلباء بالخصوص چھوٹے بچوں کے حق میں بہت مضر ہے اور سزا دینا استاد کی نااہلی کی دلیل ہے۔ ابن خلدون کا کہنا ہے کہ ظلم و تشدد اور قہر و غضب کے سلوک سے بچوں کی طبیعت بجھ جاتی ہے۔ دل سے اُمنگ، خوشی اور بشاشت فرار ہو جاتی ہے۔ طبیعت کسل مندی کا شکار ہو جاتی ہے۔ جھوٹ بولنے اور مکر و فریب سے کام لینے کی عادت پڑتی ہے اور پھر مرور ایام سے یہ سب مصائب عادت و خلق کی طرح اس کی طبیعت میں جگہ لے لیتے ہیں اور یہ سب کچھ سختی اور تشدد کے ڈر سے ہوتا ہے۔ بلکہ متعلم کی طبیعت سے حمیت و غیرت اور جان اور اپنے گھر والوں کی محافظت کا مادہ تک اُڑ جاتا ہے اور دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے۔ نہ فضائل سیکھنے کا

شوق باقی رہتا ہے ، نہ خلق جمیل اپنے میں پیدا کرنے کی آمنگ ، غرض انسانیت کے جوہروں کو بھول بیٹھتا ہے۔

طلباء پر مار پیٹ کے مضر اثرات کو جس وضاحت سے ابن خلدون نے بیان کیا اور جس فلسفیانہ انداز سے تشدد کے نتائج سے روشناس کرایا ہے ، اس کی نظیر اس سے قبل کے مفکرین کے ہاں نہیں ملتی۔

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں جو یورپ میں مذہبی اصلاح اور سائنسی انقلاب کا عہد کہلاتا ہے ، ایک دفعہ پھر جسمانی سزا کے حق میں اعلانات ہونے لگتے ہیں ۔ اس دور کے ماہرین تعلیم نے یہ محسوس کیا کہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں سختی میں کمی اور طلباء کو ڈھیل دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے راہ رو ہو گئے۔ انہوں نے اس کج روی کا علاج جسمانی سزا تجویز کیا یہی وہ دور ہے جس میں "Spare the rod, spoil the child" کا معروف نعرہ بلند کیا گیا ۔ اس دور میں طلباء کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جانے لگا۔ اور بقائے نظم کے بہانے ان پر بے تحاشا بید برسائے جانے لگے۔ اس عہد کا ایک مذہبی رہنما اور مفکر کاٹن مارتھر (Cotton Marthor) اپنی کتاب "A Family Well-ordered" ۱۶۹۹ء میں والدین کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں میں خوف خدا اور بزرگوں کی فرمانبرداری کا جذبہ پیدا کریں اور انہیں ہر حالت میں اپنے زیر اور تابع فرمان رکھیں اور ان پر قابو پانے کے لیے جبر ، انصاف اور خوف کا آہنی پنجہ آزمائیں ۔

اگر وہ اپنے بچوں کو اس طرح سے ٹھیک نہ کر سکیں تو انہیں سخت جسمانی سزائیں دیں۔ کاٹن اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ یہاں تک تجویز کرتا ہے کہ ناقابل اصلاح بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس دور کے ان رجحانات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر Freeman Butts نے درست لکھا ہے :

"اس میں کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ اس دور کا طریقۂ تعلیم بچوں پر خوف و ہراس طاری کرنے کے مترادف تھا۔ ایسا طریقۂ تعلیم جس میں طلباء سے فرمانبرداری اور سخت جسمانی

و ذہنی نظم و ضبط کا تقاضا کیا جاتا تھا۔ ایک جابر عہد یقیناً ایسے جابرانہ نظام تعلیم ہی کو جنم دے سکتا ہے''۔

سترھویں صدی عیسوی میں امریکہ بھی یورپ کے زیر اثر اسی قسم کے نظام تعلیم کی لپیٹ میں تھا اور وہاں بھی ہمیں مدارس میں کڑے نظم و ضبط کی پابندی اور جسمانی سزاؤں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں جسمانی سزا کے خلاف ایک دفعہ پھر صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ امریکہ میں اینتھنی بینزٹ (Anthony Benezet) اپنے عہد کے مدرسین کو یہ قابل قدر مشورہ دیتا ہے کہ وہ معصوم بچوں کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان کے رجحانات اور جبلی تقاضوں کا مطالعہ کریں اور تعلیم میں جسمانی سزا کی بجائے اس کے خوشگوار اور دلچسپ پہلوؤں پر زور دیں۔ اسی عہد میں ایک مدرس کرسٹوفر ڈاک (Christofher Doch) فن تدریس پر ایک کتاب جسے امریکہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ شائع کرتا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے تجربۂ تدریس کی بناء پر یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنے طلباء کو جو عمر اور قابلیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے کس طرح پڑھایا اور کس طرح ان کے جذبۂ خود ستائی و خود نمائی کی تسکین کا سامان پیدا کرکے جسمانی سزا سے اجتناب کیا۔ اس کتاب میں وہ شاگرد استاد کے خوشگوار تعلقات پر زور دیتا ہے اور مدرسین کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ طلباء کو سمجھنے کے لیے ہمدردی اور شفقت کا دارو آزمائیں کہ یہ سزا سے زیادہ مجرب اور زود اثر ہے۔ اسی صدی میں سوئٹزر لینڈ میں ایک مشہور ماہر تعلیم روسو پیدا ہوا جس نے اپنے جدید تعلیمی نظریات سے علمی اور تدریسی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ روسو اس دور کے مروجہ نظام تعلیم کے خلاف اس لیے علم بغاوت بلند کرتا ہے کہ وہ غیر فطری اور تشدد پر مبنی تھا۔ روسو کے خیال میں بچوں کو پڑھانے اور گھوڑوں کے سدھانے میں بہت فرق ہے اور اساتذہ پر لازم ہے کہ وہ اس فرق کو نگاہ میں رکھیں اور ایسی تعلیم سے جو رٹے اور تشدد کی تخلیق ہو، دست کش ہو جائیں۔

اسی دور میں یہی خطۂ ارض ایک اور مفکر تعلیم پستالوزی کو جنم دیتا ہے جو ہمیں مروجہ طریقہ ہائے تدریس کے برعکس بالکل نئے تعلیمی نظریات سے روشناس کراتا ہے۔ پستالوزی فن تدریس کو باغبانی سے، بچے کو پودے سے اور معلم کو باغبان سے تشبیہہ دیتا ہے۔ وہ جسمانی سزا کے سخت خلاف ہے۔ اس کے خیال میں سزا بچے کی اصلی اور حقیقی نشو و نما میں حائل ہوتی ہے۔ پستالوزی کے نزدیک نظم کو قائم رکھنے کے لیے تعاون اور ہمدردی کی ضرورت ہے نہ کہ جسمانی سزا کی۔

مشہور ماہر تعلیم فروبل بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ فروبل کے دور میں ابھی ایسے لوگ موجود تھے جو بچے کو فطری طور پر بدکار اور گنہ گار سمجھتے تھے اور ان کا نظریہ یہ تھا کہ کوڑے کے بغیر بچے کا سدھار ممکن نہیں۔ فروبل نے ان نظریات کے خلاف بغاوت کا نعرہ لگایا اور بے رحم اساتذہ کو تلقین کی کہ وہ بچوں کو سزا دینے کی بجائے ان کی فطرت کو سمجھیں اور انہیں کھیل کھیل میں تعلیم دیں اس لیے کہ کھیل سے بچوں کو مسرت، آزادی، آسودگی اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر میں دو اور نامور شخصیتوں کا ظہور ہوا۔ جنہوں نے جہاں اس دور کے تعلیمی فکر کو بے حد متاثر کیا وہاں وہ طلباء کے لیے بھی پیغام امن لائے۔ یورپ میں میڈم مانٹے سوری اور امریکہ میں جان ڈیوی نے جسمانی سزا کے نظریے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مانٹے سوری نے بچے کی آزادی اور اس کی شخصیت کے احترام پر زور دیا اور اسی طرح ڈیوی نے اساتذہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تعلیمی عمل میں سزا کا سہارا ڈھونڈنے کی بجائے نفسیاتی سوجھ بوجھ سے کام لیں اور بچے کی شخصیت، اس کی فطری صلاحیتوں، رجحانات اور جبلتوں سے آگاہی حاصل کریں۔ دونوں ماہرین تعلیم نے عمل تعلیم کو دلچسپ بنانے اور اس میں گوناگوں مشاغل کو جگہ دینے پر زور دیا کہ اس طریق کار میں جسمانی سزا خود بخود معدوم ہو جاتی ہے۔

دور حاضر میں یورپ اور امریکہ کے مدارس میں نظری و عملی اعتبار سے جسمانی سزا کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے اور وہاں کے اساتذہ نے یہ راز پا لیا ہے کہ انعامات اور دیگر سماجی سزائیں، جسمانی سزا سے کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں بھی مدارس میں اساتذہ کو جسمانی سزا دینے کی اجازت نہیں اور صدر معلم بھی صرف ناگزیر حالتوں میں ایک خاص حد تک جسمانی سزا دینے کی اجازت دے سکتا ہے۔ لیکن اکثر مدارس کے اندر جھانکنے سے عمل بالعموم اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ نہ صرف ثانوی مدارس میں بلکہ ابتدائی مدارس میں بھی بچوں کو اسی طرح پیٹا جاتا ہے، جس طرح کہ یورپ کے دور جاہلیت میں انہیں مارا جاتا تھا۔ اس موضوع پر جب بھی یہاں اساتذہ سے گفتگو ہوئی، انہوں نے ہمیشہ سزا کو ایک ”ناگزیر برائی“ کہا۔ ان کے خیال میں سزا کے بغیر کمرہ جماعت اور مدرسہ میں نظم و ضبط قائم رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہمارے اساتذہ انہی فرسودہ طریقوں کو جن میں رٹے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے آزماتے رہیں گے، اگر وہ ان نفسیاتی حقائق سے آنکھیں بند رکھیں گے جو دور حاضر کے بڑے بڑے مفکرین اور ماہر تعلیم کے مسلسل تجربے اور محنت کا نچوڑ ہیں، اگر وہ تعلیم کے نئے اصولوں سے اسی طرح منہ سوڑے رہیں گے تو یقیناً نظم و ضبط قائم کرنے میں ڈنڈے کے سوا ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہو گا۔

---

# اساتذہ کی حیثیت اور ان کی تربیت

یہ امر باعث مسرت ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیم میں سرمایہ کاری کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا گیا ہے اور ہماری قومی حکومت نے تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پچھلے سالوں کی نسبت بہت زیادہ روپیہ مختص کر دیا ہے۔ ارباب تعلیم سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں کہ نظام تعلیم کی ترقی و اصلاح اس کے اساتذہ کی علمیت و صلاحیت کار پر موقوف ہے۔ مدارس کی عمارات، تدریسی ساز و سامان اور دیگر مراعات پر کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف کیا جائے جب تک بہتر کارکن اساتذہ نہ ہوں گے تعلیم کا فروغ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ پالیسی میں اساتذہ کی حیثیت کو بہتر اور ان کی تربیت کو مؤثر بنانے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس مقالے میں ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ استاد کی حیثیت و مرتبہ اور اس کی تربیت کا باہمی ربط کیا ہے۔

تفصیلی بحث سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حیثیت کی تعریف اور حدود متعین کر لی جائیں۔ حیثیت سے مراد کسی فرد یا گروہ کا وہ رتبہ، وقار اور احترام ہے جو اسے دوسرے افراد اور باقی گروہوں کے مقابلے میں حاصل ہو۔ حیثیت کے تعین میں دوسرے افراد سے تعلق، سماجی درجہ بندی اور پیشے کی افادیت و اہمیت کو خاص دخل ہے۔ در اصل حیثیت کسی گروہ کے مجموعی کردار کی روشنی میں معاشرتی درجہ بندی کا نتیجہ ہے۔ ہر معاشرے میں افراد کی امتیازی حیثیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ افراد باقی معاشرے کے لیے کس قدر قیمتی اور اہم خدمات انجام دیتے ہیں۔ مختلف افراد کے معاوضوں کا تعین بھی ان کی سماجی خدمات کی قدر و قیمت اور اہمیت کے پیش نظر ہوتا ہے۔

حیثیت کے تعین میں اخلاق کردار، پیشہ ورانہ آزادی، علمی تبحّر

اور معاشی تحفظات کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے ۔ اس کی جانچ کے لیے معاشرتی تبدیلیوں اور مخصوص ماحول کے تقاضوں کو بھی خاصی وقعت حاصل ہے ۔ اس اعتبار سے پیشہ تدریس کی حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر توجہ کرنا لازم ہے :

۱ ۔ پیشہ اختیار کرنے کے لیے علمی صلاحیت ۔

۲ ۔ مالی و معاشی فوائد ۔

۳ ۔ پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ۔

۴ ۔ مقبولیت عامہ ۔

اب ہم ان پہلوؤں کا الگ الگ جائزہ لیں گے ۔

**۱ ۔ تعلیمی حیثیت**

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تعلیمی معیار کی بلندی و بہتری کا تمام تر انحصار قابل اور لائق اساتذہ پر ہے ۔ لہذا پیشہ تدریس کی بنیادی حیثیت کا اصل معیار یہ ہے کہ اس پیشے کے ارکان کا علمی پس منظر وسیع اور پختہ اور ان کے طریقہ ہائے تدریس مؤثر اور نتیجہ خیز ہوں ۔ معاشرے میں مدرسے کا کردار اور تعلیمی مقاصد ہی پیشہ تدریس کو سماجی و عوامی خدمت کا مرتبہ بخشتے ہیں ۔ اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پیشے کو ذہین و فطین افراد کے لیے پر کشش بنایا جائے ۔ جنہیں مقاصد تعلیم کے حصول کے لیے پوری طرح تیار کیا جا سکے ۔ پیشہ تدریس کی علمی سطح ہی در اصل معیار تعلیم کا صحیح اور حقیقی مظہر ہے ۔

اُستاد کی تعلیمی حیثیت سے مراد اس کا وہ مرتبہ یا مقام ہے جو وہ کالج یا سکول کی تعلیم اور پیشہ ورانہ استعداد کی بنا پر حاصل کرتا ہے ۔ لہذا کسی اُستاد کا علمی مرتبہ جس قدر بلند ہوگا اتنی ہی اس کی حیثیت اعلیٰ ہوگی ۔ پیشہ تدریس کی فلاح و بہبود اس امر کی مقتضی ہے کہ استاد بننے کے خواہاں افراد کی تعلیمی قابلیت اور استعداد ممکن حد تک بلند رکھی جائے ۔

### ۲ - معاشی حیثیت

دوسرے پیشوں کی طرح پیشہ تدریس پر بھی اس کی معاشی حیثیت اثر انداز ہوتی ہے - اساتذہ کی خدمات جس قدر اہم ہیں اسی قدر ان کا صحیح صحیح اندازہ کرنا پیچیدہ اور مشکل کام ہے - مثلاً طلباء میں شہریت کی روح پھونکنا ، کردار و شخصیت کی تشکیل کرنا اور اخلاقی ضوابط کا احترام کرنا وغیرہ ایسی صفات ہیں جنہیں خارجی طور پر جانچنا اور ان کی مقدار یا وزن مقرر کرنا ممکن نہیں - تاہم کسی پیشے کے صحیح وقار اور مرتبے کا اظہار اس معاوضے سے بھی ہوتا ہے جو اس پیشے کے لیے مقرر کیا گیا ہے - ان حالات میں یہ مطالبہ جائز اور بجا ہے کہ اساتذہ کی سماجی و معاشی حیثیت اور شرائط کار لازماً ایسی ہوں جن سے ان کا معیار زندگی پر وقار ہو اور وہ کامل اطمینان قلب کے ساتھ اپنے آپ کو اس پیشے کے لیے وقف کر سکیں - اساتذہ کی عمومی شرائط ملازمت بھی دوسرے ہم پلہ پیشوں سے ہم آہنگ ہونی چاہئیں - ان کی تنخواہیں اتنی معقول ہوں کہ ذہین و فطین افراد اس پیشے کی طرف راغب ہوں اور پھر کسی اور پیشے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں -

### ۳ - پیشہ ورانہ حیثیت

اس حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اساتذہ اپنے کام میں پوری دلچسپی لیں - اپنے پیشے کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کریں اور معاشرے کی بہبود میں بھرپور حصہ لیں - اساتذہ کی پیشہ ورانہ خدمات اور اخلاق معیار دوسروں کے دل میں ان کے احترام کے جذبات کو جنم دیں - پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے اُستاد جس قدر مالا مال ہو گا اسی قدر اس کی وقعت ، حیثیت اور مرتبے میں اضافہ ہو گا -

### ۴ - مقبولیت عامہ

پیشہ تدریس کی حیثیت کا تعین اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اساتذہ کو قومی تعلیم کے مسائل حل کرنے میں کس حد تک شامل کیا جاتا ہے - تعلیمی کمیشنوں اور کمیٹیوں میں کس حد تک نمائندگی دی جاتی ہے - یہ امر باعث مسرت ہے کہ پاکستان میں اب اساتذہ کو

قومی امتیازات سے نوازا جا رہا ہے اور نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق اعلیٰ سطح پر قومی تعلیمی مجالس میں بھی اساتذہ کو پوری طرح شامل کیا گیا ہے - یہ رجحان واضح کرتا ہے کہ اساتذہ کو قومی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے -

جہاں تک معاشرے میں اُستاد کے مرتبے، وقار اور احترام کا تعلق ہے اس کا تعین ایک طرف اُستاد کی انفرادی مساعی پر منحصر ہے اور دوسری طرف اس بات پر بھی کہ اساتذہ نے بحیثیت مجموعی عہد رفتہ سے عصر حاضر تک پوری انسانیت کے فروغ اور اس کے ارتقاء کے لیے کیا کچھ خدمات انجام دی ہیں - اسی لیے اُستاد کی حیثیت کے متعلق کوئی ایک قطعی کلیہ غلطی کا باعث بن سکتا ہے - یہ واضح بات ہے کہ تمام اساتذہ ایک جیسی تعظیم و احترام حاصل نہ کر سکیں گے - پھر بھی کسی مخصوص معاشرے کی اقدار کے مطابق اس احترام کے لیے متنوع بنیادیں مہیا کی جا سکتی ہیں - ایک چیز بہرحال مسلم ہے کہ پیشہ تدریس کی حیثیت متعین کرنے میں معیاری تدریس کو بنیادی شرط کا درجہ حاصل ہے -

معیاری تدریس کیونکر ممکن ہے ؟ یہ سوال ہمیں زیر بحث موضوع کے دوسرے حصے یعنی ''تربیت اساتذہ'' کی طرف متوجہ کرتا ہے -

''تربیت'' کسی مخصوص کام کو پورا کرنے کے علم، مہارت اور طرز عمل کے سیکھنے سکھانے کا نام ہے- تربیت کا مقصد زیر تربیت افراد کو بدلتی ہوئی ضروریات اور روز افزوں تقاضوں کے مطابق ذہنی ارتقاء اور نشو و نما بخشنا ہے—— ہم سبھی اس حقیقت سے بخوبی باخبر ہیں کہ انسانی علوم کی حدود بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہیں - یہ وسعت نہ صرف حیران کن ہے بلکہ ان کا ساتھ دینا خاصا مشکل کام بھی ہے - اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ تفہیم اور رد عمل کے نئے اسالیب وضع ہوں - پس اُفتادہ مضامین کی تعلیم اور دقیانوسی طریقہ ہائے تدریس زندگی کے موجودہ چیلنج کا جواب دینے کے لیے کافی نہیں -

تعلیم کے جدید خیالات و نظریات اور نئے طریقے، تدریس کو مؤثر اور تسلی بخش بنانے میں اُستاد کے مدد و معاون ہیں لیکن جب تک

اساتذہ کی پوری جماعت ان نظریات اور طریقوں سے باخبر نہ ہو اور انہیں روزمرہ تدریس میں بروئے کار نہ لائے اس وقت تک یہ نظریات اور طریقے مجرد خیال سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔

یہ وہ مقام ہے جہاں تربیت اساتذہ اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ نئے خیالات اور جدید طریقوں کو اساتذہ میں اس طرح راسخ کرتی ہے کہ وہ عمل تدریس میں ان سے استفادہ کر سکیں اور آئندہ نسلوں کی تعلیم کو بہتر بنانے کا اہم کام انجام دے سکیں ۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے استاد صحیح معنوں میں معمار قوم کہلانے کا مستحق بن سکتا ہے ۔ یہی وہ امتیازی حیثیت ہے جو استاد کے فن کو دوسرے تمام پیشوں کا پیش رو بناتی ہے کیونکہ انسانی زندگی کے ذہنی، سماجی، معاشی اور اخلاقی پہلوؤں کی ترقی اور نشو و نما کا حقیقی منبع استاد ہی ہے ۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ تدریس تمام پیشوں میں عظیم تر ہے اور یہ کہ استاد کی انفرادی ممتاز حیثیت کا انحصار اس خدمت پر ہے جو وہ اپنے شاگردوں، معاشرے اور پورے پیشہ تدریس کی بہتری کے لیے انجام دیتا ہے ۔ اب ہم تربیت اساتذہ کی طرف توجہ دیتے ہیں ۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ تدریس ایک ایسا فن ہے جو خصوصی تربیت اور مہارت کا محتاج ہے ۔ ایک شخص کی ذہانت، علمیت اور صلاحیت ۔ تسلیم! لیکن مؤثر طریقے سے اپنے علم کو دوسروں تک منتقل کر دینا بالکل دوسری چیز ہے اور یہی دوسری چیز تربیت سے سیکھی جاتی ہے ۔ اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں کہ ایک محدود مدت کے لیے تربیت حاصل کر لینا زندگی بھر کفایت کرتا اور تربیت یافتہ استاد کو مزید تربیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز کر دیتا ہے ۔ تربیت ایک مسلسل اور پیہم عمل ہے جسے جاری رہنا چاہیے ۔ کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آج سے دس بارہ سال قبل اس نے جو رسمی تربیت حاصل کی تھی وہ اسے ہمیشہ کے لیے کامل استاد بنا سکتی ہے ۔

تربیت کا بنیادی مقصد یہ نہیں کہ استاد کو چند ایسی مہارتیں سکھا دی جائیں جو اس کے نتائج بہتر بنانے میں ممد ہوں ۔ بلکہ اس کا مقصد تو استاد میں صحیح طرز کے ایک کردار کا نقش ثبت کرنا ہے ۔ ایسا

کردار جو ایک طرف اُستاد میں یہ صلاحیت پیدا کر سکے کہ وہ علمی وسعتوں میں پرواز کے قابل ہو اور دوسری طرف اسے نظم و ضبط، ہمدردی، رواداری اور اپنے پیشے پر فخر کرنا سکھائے۔

اساتذہ کا تربیتی پروگرام اگر صحیح خطوط پر مرتب کیا جائے اور اسے پوری طرح پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اساتذہ تدریسی مہارتوں کو بہتر طریقے سے اخذ کریں گے، ان میں ذاتی اعتماد پیدا ہوگا اور ان کا تدریسی کام کیفیت و کمیت کے اعتبار سے معیاری ہوگا۔ اگر تربیت کے بعد اُستاد میں یہ متوقع خوبیاں پیدا ہو جائیں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ تربیتی پروگرام مناسب ہے۔ لیکن اگر رسمی تربیت کے بعد بھی اُستاد بے اعتمادی، تزلزل، اور تردد کا شکار ہو تو یہ کہنا بجا ہے کہ اس کی تربیت ناقص تھی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مختصر مدت میں تربیت کا کوئی بھی پروگرام اُستاد میں شخصی تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لہذا تربیتی پروگرام کو ایک مسلسل طویل عمل سمجھا جائے۔ اساتذہ کو گاہ گاہ تجدید تربیت کے مواقع مہیا کیے جائیں تو ہمیں کامل توقع ہے کہ اعلیٰ صلاحیتوں کے اُستاد پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اساتذہ کے تربیتی ادارے موجودہ حالات میں زیر تربیت اساتذہ کو پیشہ ورانہ صلاحیت بہم پہنچانے اور تدریسی مہارتیں سکھانے کی قابل قدر سعی کر رہے ہیں اور زیر تربیت اساتذہ کو نظریے اور عمل میں مطابقت کے مواقع مہیا کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں بلاشبہ بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن در حقیقت اُستاد کی تعلیم اُس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ تربیت گاہ سے فارغ ہو کر کمرہ جماعت کے ماحول سے دوچار ہوتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اس کی حوصلہ افزائی، پیشہ ورانہ مشکلات میں رہنمائی اور طلباء، رفقائے کار، والدین اور معاشرے سے صحت مند روابط استوار کرنے میں مدد و تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، کوئی اُستاد بھی زندگی بھر کے لیے ٹرینڈ نہیں کیا جا سکتا—علم کی حدود تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ تعلیمی مواد میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا

ہے ۔ سماجی علوم کے محققین انسانی طرز عمل کے اسالیب کو قابل فہم بنا رہے ہیں جو تدریسی طریقوں کی جانچ پرکھ کرنے میں معاون ہیں ۔ لہذا ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیمی میدان میں ہونے والی تحقیقات و انکشافات سے باخبر رہے ۔ اسی لیے ایک استاد کے لیے دوران ملازمت تربیت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی قبل از ملازمت تربیت اور یہی وہ ضرورت ہے جسے پورا کرنے کے لیے مرکز توسیع تعلیم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے ۔

دوران ملازمت تربیت کے پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ اساتذہ کو اپنے تجربات و نظریات کا تبادلہ کرنے اور عمل تدریس کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں ـــــ دوران ملازمت تربیت کا مقصد صرف علم کو تازہ کرنا ہی نہیں بلکہ تدریسی جذبے کی تجدید کرنا بھی ہے تاکہ اساتذہ واپس جا کر بہتر صلاحیتوں کے ساتھ تدریسی کام انجام دے سکیں ۔ چونکہ تجدید تربیت کے پروگرام میں صوبے بھر کے تجربہ کار اساتذہ کو جمع کیا جاتا ہے اس لیے اس سے بہت سے سماجی فائدے حاصل ہوتے ہیں ۔ نئے روابط استوار ہوتے ہیں ، مقاصد تعلیم کی بہتر تفہیم ہوتی ہے اور اساتذہ کے تنظیمی امور انجام پاتے ہیں ۔ قبل از ملازمت تربیت کا ایک بڑا فائدہ ملازمت کا حصول ہے ۔ سوئے قسمت سے دوران ملازمت تربیت سے فی الحال کوئی قابل ذکر فائدہ نظر نہیں آتا ۔ مناسب یہ ہے کہ تجدیدی تربیتی کورسوں کو محض سزا یا عیاشی نہ سمجھا جائے بلکہ اسے ایک ایسی ضرورت قرار دیا جائے جس سے استاد کو تعلیمی افادیت کے علاوہ کچھ مالی مفادات بھی حاصل ہوں ۔ یہ چیز استاد کو معاشرے میں اچھے مرتبے اور بہتر حیثیت کے حصول میں یقیناً مدد دے گی ۔

قبل از ملازمت اور دوران ملازمت تربیت کی ہم آہنگی کے سلسلے میں مجھے آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ٹریننگ کالج ، ادارہ تعلیم و تحقیق اور مرکز توسیع تعلیم اساتذہ کی ذاتی ، سماجی اور پیشہ ورانہ نشو و نما کے مشترک ذمہ دار ہیں ۔ تربیتی ادارے ، اساتذہ کو اصول تعلیم اور طریقہ تدریس کا بنیادی علم بخشتے ہیں اور تدریسی مبادیات

سے متعارف کراتے ہیں جب کہ مرکز توسیع تعلیم ان اصولوں کو عملی تجربات سے وابستہ کرنے کے لیے علمی غذا بہم پہنچاتا ہے۔ یہ تینوں ادارے تعلیمی تحقیق و تجربات کے لیے اپنے وسائل کو یکجا کر کے بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اساتذہ کی تعلیم و تربیت کو باثمر بنانے کے لیے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ یہ تینوں ادارے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ان کی سرگرمیوں میں کامل مطابقت ہو۔

---

# سلیقہ شعار معلم

ماہرین تعلیم، تدریس کو فنون کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔ وہ چیز جس کا تعلق عمل سے ہو اور وہ کام جس میں مہارت پیہم مشق کی محتاج ہو، یقیناً ایک آرٹ اور ایک فن ہے۔ مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس فن کو اس طور پر حاصل کرے اور اس میں وہ مشق بہم پہنچائے کہ اُسے فنکار مدرس کہا جا سکے۔ مدرسین کی جماعت پر نظر دوڑائیں تو عام مدرس تو ایک کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں، لیکن فنکار مدرس خال خال۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خوبیاں اور کونسے اوصاف ہیں جو ایک عام اور فنکار مدرس میں امتیاز قائم کرتے ہیں۔ ایک عام مدرس اور فنکار مدرس میں وہی فرق ہے جو ایک عام شاعر، اور فنکار شاعر، ایک عام ادیب اور فنکار ادیب اور ایک عام افسانہ نگار اور ایک فنکار افسانہ نگار میں ہوتا ہے۔ جس طرح ایک عام شاعر کے اشعار رفعت تخیل سے محروم، خلوص سے عاری اور سلیقے کے محتاج ہوتے ہیں یا جس طرح ایک عام افسانہ نگار کے افسانے پلاٹ کے لحاظ سے ڈھیلے، واقعات کے لحاظ سے غیر فطری اور تاثر کے نقطہ نظر سے سپاٹ ہوتے ہیں یا ایک عام ادیب کے ادب پارے ایک بد نظمی، بے ہنگم پن اور بدسلیقگی کے مرقع ہوتے ہیں اسی طرح ایک عام معلم کے اسباق سلیقے کے جوہر سے محروم اور تاثر اور دلچسپی کے اعتبار سے صفر ہوتے ہیں۔ اس کے سبقوں میں وہ جاذبیت نظر نہیں آتی جو ایک سگھڑ خاتون کی گھریلو ترتیب یا ایک سلیقہ مند آرٹسٹ کی تصویروں میں نمایاں ہوتی ہے۔ فنکار استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک سلیقہ شعار مدرس ہو۔ اس کا ہر سبق اور اس کی تدریس کی ایک ایک منزل اس کے شستہ ذوق کی عکاسی کرے اور اس کے سلیقے اور نفاست کی آئینہ دار ہو۔

**سلیقہ کیا ہے؟**

سلیقہ ذوق کی اس صفت کا نام ہے جس کے ذریعے لطافت اور تناسب کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ سلیقہ اگر ادب کی روح ہے تو تدریس کی جان۔ سبق کی ابتدا سے لیکر انتہا تک ایک سلیقے کی ضرورت ہے۔ عبارت برائے مطالعہ کے انتخاب سے لیکر اس کی تدریس اور اس کے اختتام تک کا سارا کام سلیقے پر مبنی ہوتا ہے۔ سلیقہ گو ایک ذھنی اور داخلی صفت کا نام ہے مگر شاعر، مصنف اور مدرس اس کے ذریعے فن کی خارجی شکل و صورت کو روپ دیتے اور اپنے شاھکاروں کی نوک پلک درست کرتے ھیں۔ سلیقہ تخلیق حسن میں بہت بڑا حصہ لیتا ہے اور سبق کی مختلف کڑیوں میں توازن و تناسب اسی کا مرھون منت ہے۔ سلیقے کی تعریف میں میر صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا اور درست ہے:

سلیقہ شرط ہے ہر اک امر میں    عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیے

میر صاحب کو تو اپنی سلیقہ مندی پر بڑا ناز ہے۔ وہ اس جوھر کو اپنے لیے وجۂ افتخار سمجھتے ہوئے فرماتے ھیں:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت بھی    تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

وہ محبت میں تو سلیقہ بقول میر تقی میر ناکامیوں کو کامرانیوں میں بدل دیتا ہے۔ لیکن دنیائے تدریس میں سلیقے کا جوھر جس کے ھاتھ آ جائے اسے قدم قدم پر سوائے کامیابی کے اور کچھ پیش ھی نہیں آتا۔ پس مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سبق کے ھر حصے میں سلیقے کو پیش نظر رکھے۔ اس کی تمہیدی گفتگو جس کا مقصد بچوں کو نئے سبق کے لیے تیار کرنا یا اصطلاح میں ''تحریک ذھنی'' ہوتا ہے، سلیقے کا مرقع ھو۔ وہ اپنے سلیقے سے دور از کار باتوں کو نظر انداز کرتا ھوا نہایت ضروری اور کام کی باتیں بتائے۔ بچوں کی دل چسپیوں اور ان کی طبعی رجحانات کو نگاہ میں رکھے۔ لیکن سبق کے مفہوم سے دور نہ جانے پائے۔ کسی شاعر اور مصنف کی زندگی کے حالات سنائے تو ھر جماعت کی استعداد اور تقاضائے سبق کے پیش نظر اس کی زندگی کے انھی گوشوں کو بے نقاب کرے۔ جو مفید اور از بس ضروری ھوں۔

چھٹی جماعت کے طلباء کو یہ بتانا کہ غالب شراب کا رسیا تھا اور غالب کا یہ شعر سنانا کہ

قرض کی پیتے تھے مے اور کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مدرس کی بے سلیقگی کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ سے مربوط اردو مضمون کو تاریخی رنگ دینا تو بجا لیکن اسے محض تاریخ کا سبق بنا دینا کہ سننے والے کو وہ ادب اور زبان کا سبق ہی نظر نہ آئے، سلیقے کے فقدان کا مظاہرہ کرنا ہے۔ بچے کی تحریک ذہنی کے لیے نفس مضمون سے الگ ہو کر کوئی کہانی یا لطیفہ سنانا نہ صرف تضیع اوقات ہے بلکہ بد سلیقگی کا اظہار۔

بعض اساتذہ تحریک ذہنی کو تفریح کا مترادف قرار دے کر بعض ایسے اقدامات کرتے ہیں کہ ان کی تمہیدی گفتگو اصل سبق سے بے ربط ہو جاتی ہے۔ یوں تو ہر سبق کی تمام منازل استاد کے سلیقے کی محتاج ہوتی ہیں لیکن یہ منزل بالخصوص اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ استاد بڑے غور اور بڑی احتیاط سے تحریک ذہنی کا سامان پیدا کرے کہ اس کی دلآویز اور سلیقہ مندانہ گفتگو سے طلباء کے اذہان خود بخود نئے سبق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور ان کا جذبۂ تجسس و اشتیاق بیدار ہو جائے۔ استاد کو یہاں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اس تحریک ذہنی میں ضرورت سے زیادہ وقت نہ لے۔ اسے چونکہ ایک محدود وقت میں سبق کو مکمل کرنا ہے اس لیے اگر اس نے وقت کے تناسب کا خیال نہ رکھا تو ہو سکتا ہے کہ اس کے عمل سے تحریک ذہنی تو وجود میں آ جائے، لیکن اس تحریک ذہنی سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے پاس وقت نہ رہے۔ تمہید کے مواد کی مناسبت اور اس کے انتخاب کے علاوہ وقت کے تناسب کا احساس بھی سلیقے ہی کا کرشمہ ہے۔ مختلف معانی رکھنے والے الفاظ میں صرف ضروری معنی بتانا، اشعار کی مناسب تشریح، عبارت پر موزوں سوالات، ان سب میں ایک سلیقے، ایک قرینے کی

ضرورت ہے اور وہ مدرس جو سلیقے ایسی نعمت سے محروم ہے تدریس سے انصاف نہیں کر سکتا ۔

**خلوص :**

سلیقے کے علاوہ ایک اور چیز جو ایک سلیقہ شعار مدرس میں بنیادی شرط کا حکم رکھتی ہے خلوص ہے ۔ کوئی فن خلوص کے بغیر اپنے اظہار میں مکمل اور کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ گویا فن اور خلوص لازم و ملزوم ھیں ۔ آج کے استاد میں اگر کسی چیز کی کمی نظر آتی ہے تو وہ یہی خلوص ہے ۔ یوں تو تقریباً ہر شے میں کام کو ٹرخانے اور بددلی سے انجام دینے کا مرض وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے ۔ لیکن تعلیم و تعلم میں تو یہ بیماری اس قدر عام ہے کہ ہمارے معلم کے رگ و پے میں رچی ہوئی نظر آتی ہے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس بد دلی کی تہ میں بہت سے عوامل کار فرما نظر آتے ھیں اور اقتصادی زبوں حالی ان میں سے ایک ہے ۔ وہ شخص جو ''پراگندہ روزی'' ہو، یقیناً پراگندہ دل بھی ہوتا ہے اور پراگندہ دل انسان سے خلوص کی توقع رکھنا عبث ، لیکن اس بحث سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ایک غیر مخلص استاد اپنی تدریس کو جاندار اور کامیاب بنا سکتا ہے ۔ خلوص کی عدم موجودگی میں کوئی فن پروان نہیں چڑھ سکتا ۔ علامہ اقبال کے نزدیک ہر ہنر اور ہر فن کے لیے خلوص ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور جس فن میں خلوص کارفرما نہ ہو وہ آنی و فانی ہے ۔ وہ اپنی شہرہ آفاق نظم مسجد قرطبہ میں کہتے ھیں

رنگ ہو یا خشت و سنگ ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

قطرہ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

نقش ھیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

مغل دور کی عمارات اور ان کے نقش و نگار ہوں یا مغنیوں اور

موسیقاروں کے سُر اور راگ ، سب اپنے صناعوں اور موجدوں کے خلوص کی واضح للکار اور خون جگر کے صحیح عکاس ہیں ۔ خلوص فن کو حیات جاودانی بخشتا اور آرٹ کو ابدی قدریں عطا کرتا ہے ۔ پرخلوص تدریس بچوں کے ذہنوں بلکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے اور معلم کا خلوص وہ رنگ لاتا ہے کہ طلباء خود خلوص کے پیکر بن کر اخلاص کے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں ۔ جذبات کو متعدی کہا جاتا ہے اور استاد کی شخصیت کا طلباء پر جس قدر گہرا اثر ہوتا ہے اسی قدر اس کے جذبات طلباء پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ایک بد دل استاد اپنے شاگردوں میں بددلی سے کام کرنے کی عادت راسخ کرتا ہے اور مخلص معلم اپنے متعلمین کو خلوص کی سی لازوال دولت عطا کرتا ہے ۔ ایک غیر مخلص استاد یقیناً اپنے فن سے وفا نہیں کرتا بلکہ اس کا منہ چڑاتا ہے ۔ فن تدریس میں خلوص کا رچاؤ ہو اور استاد شجر تعلیم کو اپنے خون جگر سے سینچے تو یہ درخت قابل رشک برگ و بار لا سکتا ہے ورنہ یہ درخت سدا بہار ہونے کی بجائے ٹنڈ منڈ نظر آئے گا ۔ ہاں کسی خوشگوار ماحول میں اتفاق سے ہری بھری کونپلیں پھوٹ نکلیں تو اور بات ہے ۔

**منصوبہ سازی :**

سلیقہ اور خلوص کے علاوہ ایک سلیقہ شعار مدرس کا تیسرا امتیازی نشان اس کی "تیاری اسباق" ہے ۔ وہ مدرس جو سبق دیکھے بغیر اور اس کی تیاری سے بے نیاز جماعت میں آتا ہے اس کی مثال بعینہ اُس ماہر فن تعمیر کی ہے جو بغیر نقشہ بنائے اور خاکہ تیار کیے ایک بہت بڑی عمارت کی تعمیر شروع کرا دیتا ہے اور جوں جوں عمارت بنتی چلی جاتی ہے وہ ہدایات جاری کرتا جاتا ہے ۔ بھلا ایسے ماہر فن تعمیر کی اس سے بڑی حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ ایک سوچے سمجھے پلان کے بغیر وہ اتنے معماروں اور مزدوروں کی محنت ، ایک کثیر رقم اور قیمتی وقت یونہی بے کار کھوتا ہے ۔ اس لیے کہ اس طرح سے بنی ہوئی عمارت اپنی ہیئت اور شکل و صورت کے اعتبار سے نہایت بے ہنگم اور غیر متناسب ہوگی ۔ ایسی عمارت میں حسن و خوبی کا پایا جانا تو

خیر دور کی بات ہے ، وہ عام تقاضوں اور ضروریات کو بھی پورا نہ کر سکے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا مکان بھی بنوانا مقصود ہو تو پوری محنت اور غور و خوض سے اس کا نقشہ تیار کر لیا جاتا ہے کہ عمارت میں کوئی خامی رہنے نہ پائے ۔

ایک آرٹسٹ کو دیکھیے ، تصویر شروع کرنے سے پیشتر گھنٹوں ذہن کے کینوس پر ایک تصویر بناتا اور خیال کے موقلم سے اس میں رنگ بھرتا ہے اور پھر کہیں جا کر اسے کاغذ کی سطح یا کینوس پر حقیقت کا روپ عطا کرتا ہے ۔

ایک افسانہ نگار افسانے کا پلاٹ سوچتا ، واقعات کا تانا بنتا اور کڑی کو کڑی سے جوڑ کر زنجیر بنا دیتا ہے ۔ پلاٹ سوچے بغیر ناول اور افسانے کا جو حشر ہوتا ہے وہ کسی ناقد سے پوچھیے یا اس افسانہ نگار سے جو نقادوں کے سامنے اسے برائے تنقید پیش کرتا ہے ۔ ایک فنکار بڑھئی کرسی اور میز بنانے سے پیشتر اس کا ڈھانچہ کاغذ پر کھڑا کر کے اس کی موزونیت اور خوبصورتی کا جائزہ اس کے ہر پہلو سے لے لیتا ہے تو پھر کیا تدریس ہی ایسا فن ہے کہ استاد بغیر تیاری اور پلاننگ کے جماعت میں جائے اور بے سوچے سوالات سے سبق کی عمارت کو ریت کی بنیادوں پر استوار کرنا شروع کر دے ۔ ایسے معلم کی مثال ، جو بغیر تیاری کے جماعت میں جاتا ہے ، اس سپاہی کی سی ہے جو پہلے سے ترکش کو تیروں سے بھر کر لے جانے کی بجائے میدان جنگ میں تیر ڈھونڈتا پھرتا ہے ۔ وہ معلم جو نئے سبق کا خاکہ تیار کیے بغیر جماعت میں جاتا ہے وہ نہ صرف اپنے طلباء سے انصاف نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے آپ کو بھی مشکل میں پھنساتا ہے اور بارہا دیکھا گیا ہے کہ ایسا مدرس کبھی خود گمراہ ہوتا ہے اور کبھی اپنے شاگردوں کو غلط معلومات بہم پہنچا کر گمراہی کے غار میں دھکیل دیتا ہے ۔ لیکن اس کے برعکس وہ معلم جو پورے مطالعہ کے بعد نئے سبق کا ایک پلان تیار کر کے جماعت میں جاتا ہے وہ تھوڑے وقت میں ایک عظیم فائدہ حاصل کرتا ہے ۔ اس کا راستہ واضح ، معین اور صاف ہوتا ہے ۔ وہ اپنے طلباء کی مدد سے تدریس کا

ایک عظیم الشان محل تھوڑے سے وقت اور معمولی سے صرف سے نہایت استوار بنیادوں پر کھڑا کر دیتا ہے اور ان خطرناک گڑھوں میں خود بھی گرنے سے محفوظ رہتا ہے اور اپنے طلباء کو بھی بچاتا ہے جن میں اکثر بے پروا اور غیر محتاط مدرس اپنے شاگردوں سمیت جا گرتے ہیں۔

سبق کی پلاننگ سے مراد یہ ہے کہ معلم ہر نئے سبق میں یہ سوچے کہ وہ تحریک ذہنی کے فریضے کو کیونکر ادا کرے گا۔ نئے مواد کو کس انداز سے پیش کرے گا کہ وہ طلباء کے لیے قابل قبول ہو۔ عبارت کے کس کس حصے کی وضاحت کی جائے گی۔ کون کون سے مشکل الفاظ تختہ سیاہ پر لکھے جائیں گے اور کون کون سے الفاظ استعمال کے ذریعے بچوں کے عملی ذخیرۂ الفاظ میں شامل کرنے ہوں گے۔ اصلاح تلفظ کی کہاں کہاں ضرورت پیش آئے گی۔ محاورات و ضرب الامثال کی تشریح کیسے ہو گی۔ عبارت کا مفہوم کن سوالات کے ذریعہ اخذ کرایا جا سکے گا۔ صرفی و نحوی نکات کا عملی اطلاق کیسے نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ سبق کے کونسے حصے میں سیرت و کردار کی تعمیر کا سبق دیا جا سکتا ہے۔ کس کس مثال، کون کون سی توضیح اور کس قسم کے چارٹ اور تصاویر سبق کو جاندار اور دلچسپ بنانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ سبق میں زبانی اور تقریری کام کتنا ہوگا اور عملی اور تحریری کتنا۔

مدرس اگر ان تمام اقدامات کا مداوا اور ان تمام منازل کو سر کرنے کا سامان فراہم کر کے چلے تو وہ کامیاب ورنہ اس کا حشر وہی ہوگا جو اس آرکی ٹیکٹ (Architect) کا ہوا، جس کی کوتاہ تیاری نے ایک خوبصورت اور وسیع عمارت کو بھول بھلیاں بنا کر رکھ دیا تھا۔

کامیاب تدریس کے لیے محض مواد تدریس کی تیاری کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ معلم کو اپنے طلباء کے طبعی اور ذہنی اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہر اس سوال کے لیے تیار کرنا ہے جو جماعت میں پوچھا جا سکتا ہے۔ اسے اپنے آپ کو کسی خاص نکتہ پر بحث و تمحیص اور تبادلہ خیالات کے لیے بھی لیس کرنا ہے۔ پھر اس تیاری میں خاصی لچک کی ضرورت ہوتی ہے۔ استاد جماعت میں

اس لیے نہیں جاتا کہ جو مواد اس نے تیار کیا ہے وہ طلباء کے سامنے اُگل دے یا جن خطوط پر اس نے تیاری کی ہے وہ بڑی سختی سے انہی خطوط پر گامزن رہے اور طلباء کے مطالبے اور تقاضے ، ان کے رجحانات اور وقتی ضروریات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی اس متعینہ راہ سے ایک قدم ادھر اُدھر نہ ہو۔ ایسی پابندی اور سختی طلباء کے لیے مفید نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرس کو اپنے موضوع کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ لیکن وہ طلباء جن کی تدریس کا کام مدرس کو سونپ دیا گیا ہے وہ اس موضوع اور مواد سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی خواہشات کا احترام ، ان کے مناسب تقاضوں کا پاس اور فطری رجحانات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر تیاری کے اس ڈھانچے سے لچک کو خارج کر دیا جائے تو اس سے جماعت کی فطری نشو و نما اور قدرتی بالیدگی کے رک جانے کا امکان ہوتا ہے اور طلباء ایسی تدریس کو جو ان کی رضامندی کے بغیر ان پر ٹھونسی جا رہی ہو اپنے اوپر جبر اور زیادتی خیال کرتے ہیں۔ انشاء پردازی کے سبق میں کسی پہلے سے سوچے ہوئے موضوع کو اس طرح جماعت کے سامنے پیش کرنا کہ تمام طلباء بطیب خاطر اس پر لکھنے کے لیے تیار ہو جائیں ، مدرس کے کمال فن اور سلیقہ شعاری کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اگر مدرس اپنی پوری قادر الکلامی اور ذہانت کے باوجود طلباء کو اس موضوع کی طرف مائل نہ کر سکے اور تمام طلباء کسی دوسرے عنوان پر طبع آزمائی کرنا پسند کرتے ہوں تو مدرس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہونا چاہیے کہ وہ ان کی بات کو مانے اور انہیں اپنی پسند کے موضوع پر کام کرنے کا موقع دے۔

**شفقت :**

مندرجہ بالا امور کے علاوہ تدریس کی دلچسپی کا دار و مدار اس کی شفقت اور اس کے ہمدردانہ رویہ میں مضمر ہے۔ معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جماعت میں ایک ایسی فضا قائم کرے جو طلباء کے لیے پر کشش اور باعث اطمینان ہو۔ ایسا ماحول جس میں طلباء

کے اذہان پر خوف مسلط رہے یا ایسی جماعت جس میں معلم اور متعلمین کے درمیان ہمیشہ ایک اجنبیت اور بعد کا پردہ حائل رہے، کامیاب تدریس کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ لڑکے استاد سے متنفر ہوں یا استاد طلباء سے، دونوں صورتوں میں طلباء کو کسی قسم کے فائدے کا پہنچنا ناممکن ہے۔ معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمدردی کے جذبے سے سرشار اور شفقت کے جوہر سے متصف ہو۔ جماعت میں ہر وقت تیوری چڑھائے رہنا، بات بات پر ماتھے پر بل ڈالنا، نفرت آلود نگاہوں سے گھورنا، ذرا سی کوتاہی پر بچوں کی گوشمالی کرنا، ایک معلم کے شایان شان نہیں۔ مدرس کو بڑا بردبار اور متحمل مزاج ہونا چاہیے۔ طلباء سے لغزشوں کا سرزد ہونا تو یقینی ہوتا ہے۔ استاد کے لیے لازم ہے کہ اصلاح کے وقت اس کا لہجہ ہمدردانہ اور رویہ مشفقانہ ہو۔ لڑکوں کو سدھارنے میں قمچی کا آزادانہ استعمال اور دیگر جسمانی سزائیں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ اگر معلم جسمانی سزا سے وقتی طور پر نظم و ضبط قائم کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ مدرس کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جماعت میں اس کی حیثیت ایک آمر اور ایک جابر و قاہر حاکم کی نہیں ہے کہ وہ طلباء پر ڈنڈے کے زور سے حکومت کرے۔ وہ بچے جو اس کی تحویل میں دیے گئے ہیں وہ بھی اس کی طرح جذبات کے پتلے ہیں۔ کچھ ان میں نازک مزاج ہیں، کچھ بہت زیادہ حساس، ہو سکتا ہے کہ کچھ ڈھیٹ بھی ہوں۔ سزا سے جہاں پہلے دو شعبوں سے تعلق رکھنے والے طلباء نہ صرف استاد بلکہ اس کی پوری تعلیم سے متنفر ہو جاتے ہیں وہاں تیسری قسم کے طلباء ڈھیٹ سے زیادہ ڈھیٹ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اچھی اور خوشگوار تدریس اچھے اور خوشگوار ماحول کی متقاضی ہے۔ جب تک خوف و ہراس کی تلوار طلباء کے سروں پر لٹکتی رہے گی اور جب تک مار پیٹ اور سزا کا ہوا ان کے ذہنوں پر مسلط رہے گا، درس و تدریس کے لیے سازگار فضا مہیا نہ ہو سکے گی۔ جسمانی سزا کا خوف طلباء کی خود اعتمادی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ وہ پڑھتے ہوئے، مدرس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے، جملے بناتے ہوئے، غرضیکہ ہر تدریسی فعل کی

انجام دہی میں جھجکتے ہیں ۔ کانپتے ہیں ۔ ان کے اندر احساس کمتری جنم لیتا ہے ۔ ذہن طرح طرح کی نفسیاتی اُلجھنوں کی آماجگاہ بنتا ہے ۔ وہ اُستاد کو ظالم، خود کو مظلوم اور تعلیم کو ذریعۂ ظلم سمجھنے لگتے ہیں ۔ استاد کی غیر حاضری ان کے لیے پیغام مسرت اور مدرسہ کی تعطیل ان کے لیے مژدہ فرحت ہوتی ہے ۔ لیکن اگر یہی معلم جماعت میں مہر و محبت کی فضا پیدا کر دے تو بقول نظیری بھگوڑے بچے مدرسے سے بھاگنا تو کجا، چھٹی کے دن بھی سکول دوڑے آئیں گے :

درس ادیب گربود زمزمۂ محبتے جمعہ بمکتب آورد طفل گریزپائے را

استاد کا سلوک اور طرز عمل ایسا ہو کہ بچے اسے اپنا دوست، ہمدرد اور رہنما سمجھیں ۔ مشکلات کے اندھیرے میں استاد ان کے لیے روشنی کا مینار اور الجھنوں کی تاریکیوں میں معلم، ان کے لیے شمع ہدایت ہو۔ علم ایک نور ہے اور اُستاد اس نور کا منبع ۔ استاد جب تک طلباء کے دلوں میں گھر نہ کر لے اور اپنے رویے سے یہ ثابت نہ کر دے کہ اس کا مقصد ان کے جسموں کو پھونکنا نہیں بلکہ اس نور سے ان کے دماغوں اور قلوب کو روشن کرنا ہے، وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ وہ معلم جو کمزور طلباء کو طنز کا نشانہ بناتا یا انہیں سرمایہ تضحیک و تمسخر سمجھتا ہے، اپنی راہ میں آپ کانٹے بوتا ہے ۔ استاد اور شاگرد میں جب تک ایک ذہنی ہم آہنگی نہ ہو اور جب تک ان کے مزاجوں میں ایک خوشگوار سمجھوتا نہ ہو جائے، اس وقت تک تدریس کا مرحلہ عقدہ لاینحل بنا رہتا ہے ۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ طلباء کے طور طریقے، مزاج اور ان کی شخصی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کرے ۔ ان کے ساتھ ایک شخصی رابطہ اور علاقہ پیدا کرے ۔ اپنے اور طلباء کے درمیان اجنبیت کی خلیج حائل نہ ہونے دے ۔ یہ کام کتنا ہی کٹھن سہی، لیکن اس کا پھل بڑا ہی رسیلا ہے ۔

---

# مغربی پاکستان میں
# تجدید نصاب کی تحریک*

۱۹۵۷ء کی بات ہے روس نے خلائی تسخیر کے لیے اپنا پہلا سپوتنک چھوڑا۔ خلا میں اس سپوتنک کی گردش نے دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک میں ایک تہلکہ مچا دیا اور یہ خلائی سیارہ روس کی سائنسی ترقی، سیاسی برتری اور اپنے حریف ممالک پر بالا دستی کی علامت بن گیا۔ امریکہ کو روس کے مقابلے میں پہلی مرتبہ اپنے عجز کا احساس ہوا۔ پوری امریکی قوم نے روس کی اس کامیابی اور خلائی میدان میں اپنی پسماندگی کو اپنے لیے وجہ ندامت سمجھا اور ہر طبقے کے لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر امریکہ اپنی تمام تر مادی ترقی، صنعتی عروج، افرادی قوت اور تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود خلائی مہم میں روس سے پیچھے کیوں رہ گیا۔ ہر شخص کی زبان پر روسی سپوتنک کا ذکر تھا اور اپنی کم مائیگی کا احساس اور ساتھ ہی خلائی تسخیر میں سبقت لے جانے کا عزم! اخبارات و جرائد میں ملک کے دانشوروں نے اس موضوع پر دل کھول کر مضامین لکھے اور ان اسباب و علل پر روشنی ڈالی جو روس کی کامیابی کا باعث تھے۔ اکثر ناقدین اور دانشور اس بات پر متفق تھے کہ روس کی خلائی برتری اور فوقیت کا راز اس کے عمدہ نظام تعلیم اور اعلیٰ نصاب تعلیم میں مضمر ہے۔ چنانچہ امریکی ماہرین تعلیم نے اپنے نظام تعلیم اور نصابات تدریس کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کیا۔ روسی نظام تعلیم کے مطالعے کے لیے امریکی ماہرین تعلیم کے وفود روس آنے جانے لگے۔ مختلف فلاحی اداروں نے لاکھوں ڈالر کے صرف سے تحقیقی مطالعے کرائے اور رپورٹیں طبع کرائیں۔ تقریباً سبھی نقاد امریکی نصاب تعلیم سے غیر مطمئن نظر آئے اور انہوں نے نصابی

---

*یہ مقالہ انجمن فاضلین کے سالانہ جلسے منعقدہ ۱۹۷۱ء میں پڑھا گیا۔

موضوعات اور درسی کتابوں کا پوسٹ مارٹم کر کے یہ ثابت کر دیا که امریکه میں ریاضی اور سائنسی علوم میں ابتدائی اور ثانوی سطح پر بالخصوص جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے وہ سب فرسودہ ، تحقیقی نقطہ نگاہ سے دور از کار اور ناکافی ہے ۔ نہ صرف یہ کہ مواد تدریس جدید سائنسی تحقیقات سے ہم آہنگ نہیں بلکه یه بھی که اس کے پڑھانے کے طریقے ایسے فرسودہ ہیں کہ ان سے طلباء میں اپج ، جدت اور انفرادیت کا پیدا ہونا تو کجا ، ان میں تقلید کا رجحان اور عمومیت کا احساس پنپتا ہے اور یوں ابتدا ہی سے بچوں کی تخلیقی اور اختراعی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں ۔ جب مرض کی تشخیص ہو جائے تو پھر علاج کی منزل آسان ہو جاتی ہے اور صحت کے امکانات روشن ! چنانچه اس بیماری کی نشاندہی کے بعد اصلاح نصاب کی مہم کا آغاز ہوا ۔ یوں تو جنگ عظیم کے فوراً بعد اصلاح نصاب کی ضرورت کا احساس ہو چکا تھا اور سائنسی علوم کے نصاب پر نظر ثانی کا کام بھی جاری تھا ، لیکن ۱۹۵۷ء کے سپوتنک کی پرواز سمند شوق پر ایک اور تازیانہ ہوا اور ہوتے ہوتے ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ یہ تحریک اپنے شباب کو آ پہنچی ۔ مرکزی حکومت کی گرانٹ اور دوسری فلاحی انجمنوں کے فراخدلانہ عطیات سے امریکه کی تین چار بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ریاضی ، طبیعیات ، کیمیا ، نباتیات اور حیوانیات کے نصابات کی اصلاح کے منصوبے تیار ہوئے ۔ ترمیم نصاب کے لیے مشاورتی کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا ۔ ان کمیٹیوں پر نامور ماہرین مضمون ، شہرہ آفاق معلمین اور مدارس کی سطح پر کام کرنے والے اساتذہ کو نامزد کیا گیا ۔ یہ لوگ موسم گرما کی تعطیلات میں جمع ہوئے اور انہوں نے نصاب میں فرسودہ موضوعات کو نکال کر ان کی جگہ ایسے تصورات اور مواد کو شامل تدریس کیا جو عصری تقاضوں اور جدید علمی تحقیقات سے ہم آہنگ تھا ۔ تشکیل نصاب کے بعد کتابوں کی تصنیف کا آغاز ہوا ۔ جدید نصاب کے مطابق کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا اور ہر باب کی تصنیف کسی ماہر فن استاد یا ماہر مضمون کے سپرد ہوئی ۔ کتابوں کی تصنیف کے بعد ماہرین مضمون نے ان پر نظرثانی کی ۔ مختلف تصورات کو واضح کرنے کے لیے تصاویر ، چارٹ ، سلائیڈ ،

فلم سٹرپ اور فلم تیار ہوئے ۔ ان کتابوں اور امدادوں کو ایک محدود پیمانے پر چند مختلف مدارس میں آزمایا گیا ۔ اساتذہ کے تجربوں اور تاثرات کی روشنی میں ان کتابوں پر نظر ثانی ہوئی ۔ ساتھ ھی ساتھ اساتذہ کی تربیت کا اہتمام بھی ھوتا رھا اور دو تین برس کے مسلسل تجربوں کے بعد ان اداروں نے اپنی تصانیف کو پورے ملک کے مدارس اور اساتذہ کے سامنے پیش کر کے انہیں دعوت فکر دی ۔ ملک کے بعض حصوں میں ان کتابوں کو بہت سراھا گیا اور بہت سے منتظمین مدارس نے اپنے پرانے نصابوں کی جگہ ان نئے نصابوں کو رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ لیکن بعض قدامت پسند حلقوں کی طرف سے انہی روایتی نصابات کی تدریس پر زور دیا گیا ۔ بہت سے مدارس ایسے بھی تھے جنھوں نے تائید کی نہ مخالفت ! بلکہ جدید نصابات کی کامیابی کے انتظار کو ترجیح دی ۔ تحریک نصاب کے قائدین بہرحال جدید نصابات اور نئے نظریات کا پرچار کرتے رہے اور قدامت پسند طبقوں کی مخالفت کے باوجود نئے نصاب بہت جلد مقبول ہونے لگے ، یہاں تک کہ دو تین برس کے قلیل عرصے میں مخالفتوں کے تمام بادل چھٹ گئے ۔ بے جا اور ناروا تنقید کا غبار بیٹھ گیا اور پورے ملک میں جدید نصابات کا بول بالا ھو گیا ۔ یہ ان انقلابی اصلاحات کا اثر تھا یا ایک قوم کے عمل پیہم کا نتیجہ کہ وہ ملک جو ۱۹۵۷ء میں خلائی تسخیر میں روس سے مات کھا گیا تھا ۱۹۶۹ء میں سب سے پہلا انسان چاند پر آتارنے میں کامیاب ھو گیا ۔

میں نے امریکہ میں تحریک نصاب کا پس منظر ذرا تفصیل سے اس لیے بیان کیا کہ یہ تحریک نہ صرف اپنی قوم کے لیے بلکہ دیگر اقوام عالم کے لیے بڑے دور رس نتائج کی حامل تھی اور مغربی پاکستان میں آج سے سات آٹھ برس قبل اصلاح نصاب کی جس مہم کا آغاز ھوا دراصل اس کے ڈانڈے اس امریکی تحریک نصاب ھی سے جا کر ملتے ھیں ۔ جب امریکی اداروں نے اپنے نصابات کو بدلا تو پاکستانی یونیورسٹیوں سے وہ فارغ التحصیل طلباء جو روایتی نصابات کی تعلیم حاصل کر کے امریکی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے عرضیاں

دیتے ، انہیں داخلے میں دقت پیش آنے لگی اور اگر داخلہ مل جاتا تو ان کا وہاں چلنا دشوار ہو جاتا ۔ یہاں کے اچھے اچھے طلباء وہاں طبیعیات، کیمیا اور ریاضی کے ادنیٰ کورسوں میں بھی ناکام ہونے لگے اور ان کے لیے وہاں اعلیٰ ڈگری کے لیے کام کرنا دشوار ہو گیا ۔ یہ خبریں پاکستان بھی پہنچنے لگیں ۔ علمی رسائل اور پیشہ ورانہ جرائد کے ذریعے بھی امریکہ میں رائج نصابی تبدیلیوں کا یہاں علم ہو چکا تھا ۔ مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کے دلوں میں اصلاح کا جذبہ موجود اور جوش موجزن تھا ۔ انہیں اس بات کا قوی احساس تھا کہ پاکستان اس وقت تک اقتصادی اور صنعتی لحاظ سے ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی نہ کرے ، اور سائنس میں ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنے تعلیمی اداروں میں سائنس کی تعلیم کو بہتر نہ بنائیں ۔ یہاں کے اکثر سائنس دانوں اور ماہرین تعلیم کو اس بات کا یقین سا ہو گیا کہ جب تک ہم اپنے نصابات کی اصلاح نہیں کر پاتے اور سائنسی علوم کی تدریس کے طریقوں میں مناسب تبدیلیاں نہیں لاتے ، ملک میں ایسے سائنسدان پیدا کرنا جو اختراعی صلاحیتیں اور تخلیقی قوتوں سے مالا مال ہوں ، محال ہے ۔ چنانچہ دانشوران پاکستان نے بھی اس موضوع پر سوچنا ، لکھنا ، پڑھنا اور گفتگو کرنا شروع کر دیا ۔ ملک کے ذہین طبقے کے ذہنوں میں اصلاح نصاب کا خیال گشت کرنے لگا ۔ تعلیمی سیمیناروں ، تدریسی کانفرنسوں اور نصابی ورکشاپوں میں اصلاح نصاب کی ضرورت پر مقالے پڑھے جانے لگے ۔ اگرچہ بہت سے اساتذہ سائنسی مضامین میں فوری اور انقلابی تبدیلیاں لانے کے متمنی تھے لیکن قدم قدم پر مشکلات کا خوف دامن گیر تھا ۔ تعلیمی معیار کی پستی ، تجربہ گاہوں کی کس مپرسی کی کیفیت ، کتابوں کی نایابی ، اور اچھے اساتذہ کی تیاری میں مشکلات ، یہ سب کے سب حوصلہ شکن عوامل تھے ۔ پھر یوں بھی اتنے بڑے اصلاحی منصوبے کو ہاتھ ڈالنا کسی ایک ادارے کے بس کی بات نہ تھی ۔ یونیورسٹیاں کچھ تو مالی پریشانیوں میں مبتلا تھیں اور کچھ وہاں کے بعض شعبوں پر ان لوگوں کا تسلط تھا جو جدتوں سے خائف اور روایات کے پابند تھے ۔ وہ زندگی،

کو ایک خاص وضعداری سے نبھانے کے قائل تھے اور اسی وضعداری کے تحت وہ روائتی نصاب کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ لہذا اس سلسلے میں پیش قدمی کی ہمت نہ کسی فرد کو ہوئی اور نہ کسی ادارے کو۔ یوں بھی ہر جدت اپنے ساتھ جہاں ایک کشش لاتی ہے وہاں وہ ناکامی، عدم استحکام اور لغزش کا احساس بھی دلاتی ہے۔ روایتی نصابات اور طریقہ ہائے تعلیم سے چمٹے رہنے میں جو سلامتی اور سہولت نظر آتی ہے وہ اکثر جدتوں کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ جب محکمہ تعلیم مغربی پاکستان کے بعض ماہرین تعلیم نے یہ دیکھا کہ اصلاح نصاب کے شدید احساس کے باوجود کوئی ادارہ اس سلسلے میں پیش قدمی کا حوصلہ نہیں رکھتا اور بعض تعلیمی اداروں پر جنہیں قیادت کا حق پہنچتا تھا، جمود سا طاری ہے تو حکومت نے خود اس تحریک کو چلانے کا ذمہ لے لیا اور مرکز توسیع تعلیم لاہور کو اس خدمت کے لیے انتخاب کیا۔ چنانچہ صوبائی سطح پر اصلاح نصاب کے لیے ریاضی، طبیعیات اور کیمیا کے مضامین کا انتخاب کیا گیا اور ان تینوں مضامین کے اساتذہ، ماہر مضمون اور نامور سائنس دانوں پر مشتمل مشاورتی کمیٹیاں قائم کر دی گئیں۔ ان کمیٹیوں پر تمام اعلیٰ تعلیمی اداروں کو مناسب نمائندگی دی گئی۔ ان نصابی کمیٹیوں نے اپنے اپنے مضمون کے رائج الوقت نصابات کا جائزہ لیا۔ پھر ان کا موازنہ ترقی یافتہ ممالک میں رائج نصابات سے کیا۔ دنیا کے مختلف ممالک کی نصابی تحریکوں کا جائزہ لیا اور وہاں کے ماہرین تعلیم کے تجربات کو ناقدانہ نگاہوں سے پرکھا اور اپنے حالات اور تعلیمی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے نصابات کو بیرونی ممالک میں رائج نصابات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مناسب تبدیلیاں کیں۔ حتیٰ کہ یہ فیصلہ ہوا کہ ۱۹۶۷ء سے ایف۔ایس سی کے طلباء و طالبات کے لیے نیا نصاب جاری کر دیا جائے۔ اس نصاب کو رائج کرنے میں ماہرین تعلیم کے سامنے دو مشکلات تھیں۔ ایک تو مناسب کتابوں کی تیاری اور اشاعت اور دوسرے اساتذہ کو نئے نصابات پڑھانے کے لیے ذہنی اور علمی طور پر تیار کرنا۔ دوسرا کام شاید پہلے کام سے زیادہ مشکل تھا۔ بہرحال تدوین نصاب کے بعد کتابوں کی تصنیف کے لیے مصنفین کے بورڈ

بنا دیے گئے ۔ مصنفین ابواب لکھتے جاتے اور ناقدین ساتھ ساتھ ان کی عبارتوں اور پیش کردہ تصورات کا تنقیدی جائزہ لیتے جاتے ۔ مختلف ابواب کی ترتیب و تصحیح کےلیے تجربہ کار اور ماہر مضمون استادوں کو مدیر مقرر کیا گیا اور چند ماہ کی محنت شاقہ کے بعد ٹیکسٹ بک بورڈ ، مرکز توسیع تعلیم کے تعاون سے ریاضی اور سائنس کی کتابیں لکھوانے اور شائع کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ کتابیں تو چھپ گئیں ۔ ان کتابوں کی تدریس کے لیے اساتذہ کو تربیت بھی دے دی گئی لیکن پھر بھی بعض اساتذہ ذہنی طور پر ان جدتوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے ۔ سالہا سال سے جو لوگ ایک ھی قسم کا مضمون ایک روایتی طریقے سے پڑھاتے چلے آ رہے تھے ، انہیں نیا مواد نئے انداز سے پڑھانے پر آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ چنانچہ نئے نصاب اور نئی کتابوں کی مخالفت میں ایک قدامت پسند گروہ اٹھ کھڑا ہوا جس نے تمام نصابی جدتوں کو بدعت قرار دیا ۔ لیکن قدامت پسند اور جدت پسند گروہوں میں یہ علمی جنگ کوئی نئی بات نہ تھی ۔ بالکل انہی مراحل سے امریکی نصابی تحریک کو بھی گزرنا پڑا تھا اور وہاں کے اخبارات ، رسائل و جرائد ، جدید ریاضی ، جدید طبیعیات اور جدید کیمیا کی سوافقت اور مخالفت میں لکھے گئے مضامین سے پر ہوتے تھے ۔ یہاں بھی اخبارات کے کالموں اور سیمیناروں کے پلیٹ فارموں کو اس کی تائید و مخالفت میں دلائل دینے کے لیے استعمال کیا گیا اس مخالفت کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ خواص کے ساتھ ساتھ عوام الناس کو بھی تجدید نصاب کے تقاضوں کا علم ہو گیا اور یہ تحریک تعلیمی حلقوں میں بہت جلد مقبول ہو گئی ۔ ۱۹۶۷ء میں اصلاح نصاب کی جس تحریک کا آغاز گیارھویں اور بارھویں جماعت کے نصاب کی تبدیلی سے ہوا ، اگلے ھی برس وہ نویں اور دسویں جماعت کے مرحلے میں داخل ہو گئی اور تشکیل نصاب کی کمیٹیوں نے جس خلوص ، لگن اور محنت سے پہلی دو جماعتوں کے نصاب میں ترامیم کی تھیں اور کتابیں لکھوائی تھیں بالکل اسی جذبے اور محنت سے انہوں نے ان جماعتوں کے ریاضی اور سائنس کے نصابات کی اصلاح کی اور نئی کتابیں لکھوائیں ۔ البتہ اس سطح پر نصابی تبدیلیوں کو اساتذہ اور تلامذہ نے زیادہ خندہ پیشانی سے قبول کیا باوجود اس کے کہ یہاں

مدارس کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ کالج کو پیش آنے والی مشکلات سے یقیناً زیادہ کٹھن تھیں ۔ کالجوں میں طلباء کی تعداد زیادہ نہ تھی ۔ تجربہ گاھیں بھی نسبتاً بہتر اور آراستہ تھیں اور اساتذہ بھی اپنے مضمون پر بہت حد تک حاوی تھے ۔ اس کے مقابلے میں مدارس کی حالت دگرگوں تھی ۔ طلباء کی تعداد کثیر، تجربہ گاھیں نہ ہونے کے برابر، سامان غائب اور اکثر اساتذہ ایسے جو ان علوم کا واجبی سا علم رکھتے تھے ۔ لیکن ان تمام مشکلات اور سواقع کے باوجود نئے نصاب مدارس میں رائج ہوئے اور مقبول بھی ۔

گیارھویں ، بارھویں اور پھر نویں اور دسویں جماعتوں میں ریاضی، طبیعیات اور کیمیا کے نصابات کو جدید سائنسی تحقیقات اور عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آھنگ کرنے کے بعد اس تحریک کی شاخیں اوپر نیچے دونوں طرف پھیلنے لگیں ۔ اس تحریک کو زیادہ بامقصد اور باثمر بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان نصابی ترامیم کو ادھر وسطانی جماعتوں کے نصاب میں سمو دیا جاتا اور ادھر بی-ایس سی کے نصاب کو ایف-ایس سی کے نصاب سے ہم آھنگ کر دیا جاتا تاکہ نصاب میں ایک تسلسل ، ایک ہمواری اور ایک امتزاج قائم ہو جاتا ۔ چنانچہ بی ۔ ایس سی اور وسطانی جماعتوں کے نصابات کی ترمیم کا کام ایک ساتھ شروع ہوا ۔ بی-ایس سی کے نصاب میں اصلاحات کرنے کے بعد سب سے بڑا مرحلہ کتابوں کی فراھمی کا تھا ۔ اعلیٰ سطح کے طلباء کے لیے سائنسی مضامین میں کتابیں لکھوانا اور چھپوانا کوئی ایسا آسان کام نہ تھا ۔ یہاں بھی مالی مشکلات اور دیگر موانعات کے باعث کسی ادارے نے اس مضمون کی ذمہ داری قبول کرنے کی ھامی نہ بھری ۔ باھر سے کتابیں منگوانا بھی مناسب نہ تھا ۔ ایک تو وہ مہنگی تھیں اور دوسرے باھر کی کوئی ایک کتاب ھمارے کسی مضمون کے پورے کورس کی کفالت کرنے سے قاصر تھی ۔ چنانچہ فیصلہ یہی ہوا کہ ھمیں اپنی ضروریات کے مطابق اپنی کتابیں خود لکھوانی اور چھپوانی چاھئیں ۔ انٹر یونیورسٹی بورڈ کی سفارش پر حکومت مغربی پاکستان نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور بی ۔ ایس سی کے طلباء کے لیے ریاضی ، طبیعیات اور کیمیا کے مضامین میں کل چودہ کتابیں چھپوانے کا

مسودہ تیار ہوا، جن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت نے ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کا صدر دفتر مرکز توسیع تعلیم میں قائم کیا گیا۔ ان چودہ کتابوں میں سے ہر کتاب کی تصنیف کے لیے مصنفین، ناقدین اور مدیران کے بورڈ بنائے گئے اور ان لوگوں کی محنت اور تعاون سے یہ تنظیمی کمیٹی دو سال کے مختصر عرصے میں چودہ کی چودہ کتابیں شائع کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ کتابیں طباعت کے لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک میں چھپنے والی کتابوں سے کسی طرح بھی کم نہیں اور ان کی قیمت بھی مقابلتاً بہت کم ہے۔

کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ بی۔ایس سی کی سطح پر پڑھانے والے اساتذہ کی تربیت کا کام بھی جاری رہا اور ۱۹۷۰ میں ریاضی، کیمیا اور طبیعیات کے اساتذہ کے لیے ایک ایک ماہ کے کورس پنجاب یونیورسٹی کے متعلقہ شعبہ جات میں منعقد ہوئے۔ جہاں بی۔ایس سی کی اعلیٰ سطح پر تجدید نصاب کا کام ہوتا رہا وہاں وسطانی جماعتوں کے نصاب کی ترمیم کا کام بھی پوری رفتار سے جاری رہا۔ یہاں البتہ کتابوں کی تیاری اور اساتذہ کی تربیت کے کام میں دوسری منازل تعلیم کے مقابلے میں زیادہ محنت اور کاوش سے کام کیا گیا۔ کتابوں کی تصنیف میں ایک جدت تو یہ کی گئی کہ باقی جماعتوں کی طرح نئی کتابوں کو تمام مدارس میں ایک ساتھ رائج کرنے کی بجائے ان کتابوں کا ایک آزمائشی ایڈیشن شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں چھٹی جماعت کی ریاضی اور سائنس کی کتابوں کا آزمائشی ایڈیشن شائع ہوا جسے پہلے چھٹی جماعت کے اساتذہ کے تربیتی کورسوں میں آزمایا گیا اور اس کے بعد صوبے بھر کے پائلٹ مدارس میں ان کی آزمائشی تدریس کا انتظام کیا گیا۔ اس آزمائشی عرصے میں کتاب کے حسن و قبح کا پوری طرح سے جائزہ لیا گیا اور اساتذہ کے مشوروں اور ان کے تاثرات کی روشنی میں کتاب پر نظرثانی کی گئی اور ۱۹۷۱ء میں اس کتاب کا باقاعدہ ایڈیشن شائع کر کے صوبے کے تمام مدارس میں رائج کر دیا گیا۔ اب یہی تجربہ ساتویں جماعت کی ریاضی اور سائنس کی کتابوں پر جاری ہے اور انشاء اللہ اگلے برس تک ان کتابوں

کا باقاعدہ ایڈیشن اساتذہ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔*

اصلاح نصاب کے پروگرام کے مطابق اپریل ۱۹۷۳ء تک آٹھویں جماعت کے لیے سائنس اور ریاضی کی نئی کتابوں کے باقاعدہ ایڈیشن چھپ چکے ہوں گے اور ان جدید نصابات کو پڑھانے کے لیے تین ہزار سالانہ کی رفتار سے تقریباً ۹ ہزار اساتذہ بھی تیار ہو چکے ہوں گے۔

اصلاح نصاب کی اس تفصیلی روداد سے آپ نے یہ جان لیا ہوگا کہ ہماری نصابی تحریک کا آغاز ۱۹۶۷ء میں ہوا اور پانچ سال کے قلیل عرصے میں ہم نے چھٹی سے بی۔ ایس سی تک کی جماعتوں کو ایک تحریک کی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ نصابی تحریک محض نصابوں کی تبدیلی، نئے موضوعات کے شمول اور فرسودہ اور دقیانوسی تصورات کے خروج سے عبارت نہیں بلکہ یہ تحریک اس کے علاوہ بھی اپنے جلو میں بہت کچھ رکھتی ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ جدید سائنسی تصورات اور نظریات کو اس طرح سے پڑھایا جائے کہ طلباء کی تخلیقی اور اختراعی صلاحیتیں بیدار ہو جائیں۔ طلباء کا جذبۂ تجسس جاگ اٹھے، ان میں ایک ایسا انسان جنم لے جس کی زد میں پورا گردوں ہو اور جو ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ جو حق کی تلاش میں بڑی سے بڑی مشکل سے نہ گھبرائے۔ جس میں سیکھنے، ڈھونڈھنے، تحقیق کرنے اور حقیقت کو پا لینے کی سچی خواہش موجود ہو۔ جس کے رجحانات نئے سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں اور جس کے نظریات جدید تحقیقات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں سائنسی مضامین کے بعض موضوعات میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں وہاں سائنسی علوم کے طریقہ ہائے تعلیم میں بھی خوشگوار اور دور رس تغیرات کی بھی سفارش کی گئی۔ عملی کام کو پہلے سے

* ساتویں جماعت کے لیے سائنس اور ریاضی کے باقاعدہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب یہی عمل آٹھویں جماعت کی ریاضی اور سائنس کی کتابوں پر کیا جا رہا ہے۔ مصنف (مئی ۱۹۷۲ء)

بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ سوال کا جواب اتنا اہم نہ رہا جتنا کہ جواب تلاش کرنے کا سلیقہ اور طریقہ! بچوں کو یہ بتایا جانے لگا کہ اصل چیز نہ تو سوال کا جواب ہے اور نہ وہ مواد تدریس جو ان کے ذہنوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ بلکہ بنیادی چیز وہ مہارت ہے جس سے سوال کا حل دریافت کیا جاتا ہے اور وہ انداز فکر ہے جو مواد کی تحصیل میں کام آتا ہے۔ سائنسی علوم کی تدریس کا اصل مقصد یہ ہے کہ بچے میں حصول علم کی لگن، تحقیق و جستجو کا شوق اور حقائق کو خود دریافت کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔

اس نصابی تحریک سے ہم نے بہت کچھ پایا اور شاید کچھ کھویا بھی، اور ان دونوں کا مختصر سا تذکرہ یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ اس تحریک سے یقیناً ہمارا نصاب پہلے سے زیادہ بامقصد اور بامعنی ہو گیا۔ اس سے سائنسی علوم کی تدریس کو ترویج و ترقی ہوئی۔ بہت سی تجربہ گاہوں کو سائنس کے نئے سامان سے بھر دیا گیا۔ جدید نصاب کو پڑھانے کے لیے اعانتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ سائنس کی تدریس کے لیے تعلیمی اداروں کو بھاری رقوم کی امدادیں ملیں اور یوں مدارس کی حالت پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی۔ ہمارے طلباء ان بنیادی سائنسی تصورات سے روشناس ہو گئے جو جدید تحقیق کی جان اور سائنس دانوں کی حالیہ کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ریاضی، طبیعیات اور کیمیا کے مضامین کے نصابات ترقی یافتہ ممالک میں رائج نصابات سے بہت حد تک ہم آہنگ ہوئے اور ہمارے طلباء کے باہر کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات بھی روشن ہو گئے۔ لیکن اس تحریک میں ہم نے کچھ کھویا بھی۔ ایک تو اس تحریک سے انسانی رشتوں کو دھچکا سا لگا۔ دوسرے اس تحریک سے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں مزید دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ سائنس کے پرانے نصاب کی کتابوں کو بڑی محنت سے اردو میں منتقل کر دیا گیا تھا اور بعض اساتذہ نے اردو میں تدریس بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن جب نصاب بدلا تو مصنفین نے نئی کتابوں کو پھر انگریزی ہی میں تحریر کیا اور شاید اسی میں آن کی سہولت تھی۔

چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ سائنسی کتب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام پھر ملتوی ہو گیا اور یوں اردو زبان سائنسی علوم کا ذریعہ بنتے بنتے ایک مرتبہ پھر اپنے مقام سے گر گئی۔

اصلاح نصاب کی اس تحریک کی ایک اور خامی جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ کہ نصابی اصلاحات کو ذرا عجلت اور رواروی میں رائج کر دیا گیا۔ چنانچہ جدتوں کو پیش کرنے اور نئی اصلاحات سے اساتذہ اور تعلیمی اداروں کو روشناس کرانے کے لیے جس ٹھہراؤ، تدبر اور سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے یہ تحریک اس سے بہت حد تک محروم رہی۔ اس کا لابدی نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کا تعلیمی معیار پر وہ نقش ثبت نہ ہو سکا جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ تعلیمی ادارے ان تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ ہو سکے اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اصلاحات ان کے ذہنوں سے نہیں ابھریں بلکہ ان پر اوپر سے ٹھونسی جا رہی ہیں۔ وہ احساس اشتراک جو نصاب کی ہر تبدیلی میں اُستاد میں پایا جانا چاہیے، اس عجلت نے پیدا نہ ہونے دیا۔ اسی طرح سے نصابی اصلاحات کے فوری اور ہمہ گیر عمل درآمد کے باعث کتابیں بڑی رواروی میں لکھی گئیں اور ان میں وہ خوبیاں نہ پیدا کی جا سکیں جن کا ایک اچھی درسی کتاب میں پایا جانا از بس ضروری ہے۔ البتہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے اب جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ پہلی کتابوں سے بعض لحاظ سے یقیناً بہتر ہیں۔

نصابی اصلاح کی اس تحریک میں ایک خامی جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تحریک صحیح معنوں میں جامع نہ تھی۔ مثلاً ہم نے سائنسی علوم میں سے صرف طبیعیات، کیمیا اور ریاضی میں کام کیا اور نباتیات اور حیوانیات کو بالکل نظر انداز کر گئے۔ حالانکہ یہ تمام علوم بھی مدرسے اور کالج کی تمام سطحوں پر پڑھائے جاتے ہیں اور کم از کم اتنے ہی اہم ضرور ہیں جتنے کہ مذکورہ بالا مضامین۔

یہ نصابی تحریک اگرچہ عصر حاضر کے تقاضوں اور سائنسی مضامین کی جائز اہمیت کے عین مطابق صرف سائنسی مضامین تک ہی محدود

رہی تاہم اس سے نصاب میں ایک عدم توازن کا احساس نمایاں طور پر نظر آنے لگا ہے اور وہ یوں کہ ہم اب تک دیگر عمرانی اور انسانی علوم کے نصاب کی تجدید اور بہتری کے لیے کوئی کام نہیں کر سکے ۔ حالانکہ یہ علوم بھی معاشرے کی بقا ، اس کے ارتقاء اور اخلاقی اقدار کے احیاء کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک بھی ترقی نصاب کے معاملے میں اسی عدم توازن کا شکار رہے ہیں اور وہاں کے معاشرے کی اخلاقی اقدار اس عدم توازن کی وجہ سے بری طرح مجروح بلکہ مسمار بھی ہوئی ہیں ۔ لیکن جن معاشروں کی اساس مادیت پر ہو ، وہاں یہ احساس عدم توازن معاشرے میں ایک کسک تو پیدا کرتا ہے مگر اس سے زندگی اجیرن نہیں ہو جاتی ۔ لیکن اس کے برعکس اگر یہی عدم توازن ایک ایسے معاشرے میں برپا رہے جو اخلاقی چوکھٹوں پر کسا ہوا ہو اور جو روحانی قدروں کی بالا دستی کا دعویٰ کرتا ہو تو پھر معاشرہ نہ صرف اپنی میراث عظمیٰ سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اس کے بھٹک جانے کے امکانات بھی خاصے روشن ہو جاتے ہیں اور ایسے غیر متوازن نصاب سے پھر جو انسان پیدا ہوتا ہے وہ علامہ اقبال رح کے ان اشعار کی تفسیر بن جاتا ہے :

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

حاصل کلام یہ کہ اصلاح نصاب کی تحریک کے علمبرداروں پر لازم ہے کہ وہ اس تحریک کو غیر متوازن ہونے سے بچانے کے لیے سائنسی علوم کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی و عمرانی علوم کے نصابات پر بھی نظرثانی کرتے رہیں تاکہ یہ علوم مواد اور طریقۂ تدریس کے اعتبار سے زمانے کے تقاضوں اور معاشرے کی ضروریات سے ہم آہنگ رہیں ۔

# ثانوی مدارس کی تشکیل نو

عصر حاضر کے نظام تعلیم میں ثانوی مدارس کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ یہ منزل قوم کی تربیت یافتہ افرادی طاقت (Trained manpower) کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ کوئی اسے قومی معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی تصور کرتا ہے اور کوئی اسے معاشری اصلاح و بہبود کا ایک مؤثر آلہ قرار دیتا ہے۔ یہ بات بہر حال بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ثانوی تعلیم کا ملک کی اقتصادی ترقی اور معاشری بہبود کے ساتھ گہرا اور مضبوط رشتہ ہے۔ ثانوی تعلیم کا نظام جتنا زیادہ مؤثر اور عمدہ ہوگا، اسی نسبت سے کسی ملک کے اقتصادی نظام کے فروغ کی توقع کی جا سکتی ہے، اور ثانوی تعلیم کے پروگرام سے جس قدر زیادہ تعداد میں لوگ فیضیاب ہوں گے اسی قدر قومی آمدنی (National Income) میں اضافے کی شرح بڑھتی جائے گی۔ ہاربی سن (Harbison) کی تحقیق کے مطابق ثانوی مدارس میں طلباء کی تعداد اور اس کا ملکی آبادی سے تناسب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ایک قوم کا اقتصادی چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔

ثانوی تعلیم کی مذکورہ اہمیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ایک طرف تو ہم زیادہ سے زیادہ طلباء کو ثانوی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور دوسری طرف اس کا معیار بلند کریں اور اس کی افادیت کو اس حد تک بڑھائیں کہ وہ ملک کے اقتصادی، معاشری اور روحانی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس وقت پاکستان کے مڈل اور ہائی اسکولوں میں طلباء کی مجموعی تعداد بیس لاکھ سے کچھ اوپر ہے اور ملکی آبادی سے اس کا تناسب کوئی دو فی صد بنتا ہے جو ترقی یافتہ ممالک کے تناسب کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے مطابق ۱۹۶۰ء میں ۱۱ سے ۱۶ سال کی عمر کے طلباء کا ۱۲ فی صد حصہ ثانوی مدارس میں زیر تعلیم تھا۔ اب یہ نسبت ۱۲ فی صد سے بڑھ کر

۱۶ فی صد تک پہنچ چکی ہے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے میں بھی اس میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا ہے۔ لیکن ثانوی مدارس میں طلباء کی تعداد میں یہ اضافہ اور توسیع اسی صورت میں مطلوبہ نتائج پیدا کر سکتی ہے جب خود اس کا دامن معیار کے دامن سے بندھا ہو۔ ایسی توسیع جو تعلیمی معیار کی پستی کی پیغامبر ہو، نہ لائق التفات ہے نہ باعث افتخار۔ ثانوی تعلیم کے لیے جس طرح معیاری ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس پر یہ بھی لازم ہے کہ عصر حاضر کے علمی، تکنیکی، اقتصادی اور معاشری تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اس میں اتنی لچک ہو کہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور اس کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ اس میں اتنی صلاحیت ہو کہ روز افزوں علمی معلومات اور سائنسی تغیرات کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ وہ عالی حوصلہ اور وسیع دامن ہو۔ تغیر پذیر اور ترقی پسند ہو۔

اگر ہم اپنے ثانوی مدارس کے تعلیمی پروگرام، تدریسی سہولتوں، نصاب اور طریقہ ہائے تعلیم کا تنقیدی جائزہ لیں تو تقریباً وہی صورت حال پائیں گے جو آج سے بیس تیس سال قبل تھی، بلکہ اکثر حالات میں اس سے بھی بدتر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معیار بڑھنے کی بجائے اور گر رہا ہے۔ مضامین تدریس میں تنوع اور فنی اور تکنیکی شعبوں کے اجراء کے باوجود زیادہ تر ثانوی مدارس آج بھی وہی افراد پیدا کر رہے ہیں جو کلرکی کو ہنر مندی پر ترجیح دیتے ہیں، جو بغیر کسی واضح نصب العین کے اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھرتے ہیں، جو ملکی معیشت اور معاشری وقار کو سنبھالا دینے کی بجائے اُلٹا اُسے گزند پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ صورت حال اتفاق یا حادثاتی نہیں۔ اس میں بہت سے عوامل کارفرما ہیں، مثلاً جامد نصاب، فرسودہ طریقہ ہائے تعلیم، کلاسوں میں طلباء کا ہجوم، تہی مایہ اور کم مشاہرہ پانے والے استاد، گھٹیا کتابیں، ناکافی سہولتیں، ماحول کی گھٹن، ناقص طریق امتحانات، مناسب تعلیمی و فنی رہنمائی کا فقدان، وغیرہ۔

ثانوی تعلیم کے بارے میں یہ احساسات اور تاثرات نہ بالکل نئے ہیں نہ ذاتی۔ یہ دھڑکن کسی ایک دل کے ساتھ مخصوص نہیں، سب کی

مشترکہ دھڑکن ہے ، ہر حساس دل کی آواز۔ یہ احساسات کبھی تعلیمی کمیشنوں کی رپورٹوں کے صفحات پر آبھرے اور کبھی ہمارے تعلیمی منصوبوں کے قرطاس کی زینت بنے۔ کوئی ماہر تعلیم ایسا نہیں جس نے ان خرابیوں کا رونا نہ رویا ہو، کوئی کمیشن ایسا نہیں جس نے ان بیماریوں کی نشاندھی نہ کی ہو اور پھر اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں اس کا علاج تجویز نہ کیا ہو۔ کسی نے کہا کہ ملک کی بڑھتی ہوئی صنعتی ضروریات کے پیش نظر ٹیکنیکل ہائی اسکول کھولے جائیں - ایسے اسکول جو طلباء کی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان کے تکنیکی رجحانات کو جلا دے سکیں - چنانچہ چند ٹیکنیکل ہائی اسکول کھول دیے گئے ، لیکن ان کے قیام کے بعد بعض ماہرین تعلیم نے محسوس کیا کہ یہ ادارے اپنے مقصد اور پروگرام کے اعتبار سے محدود ہو کر رہ گئے ہیں - ان اداروں میں فنی تعلیم کے علاوہ دوسرے شعبے اپنی افادیت کھو چکے ہیں - عمومی تعلیم (General education) کا پہلو تشنہ اور خام ہے - مضامین میں تنوع کا جو خواب ہمارے ماہرین تعلیم نے دیکھا تھا ، ٹیکنیکل ہائی اسکول اس کی تعبیر نہ بن سکا - اس لیے جب نیا منصوبہ بنا تو ٹیکنیکل مدارس کی جگہ پائلٹ اسکولوں (Pilot schools) کو فروغ دینے کی تجویز ہوئی - اس نئی اسکیم کا مقصد ثانوی مدارس کو کثیر المقاصد یا جامع اداروں میں تبدیل کرنا تھا - چنانچہ چند نئے مدارس کھلے اور بعض پرانے لیکن ترقی پذیر مدارس کو بھی اس اسکیم میں شامل کر لیا گیا - علمی (Academic) اور تکنیکی (Technical) شعبوں کے عدم تعاون کو مٹانے کی کوشش کی گئی- ریاضی اور سائنس کی تعلیم پر پہلے کی نسبت زیادہ زور دیا جانے لگا - فنی رہنمائی اور مشاورت کا چرچا بھی سننے میں آیا اور تعلیمی سہولتوں کا معیار بلند کرنے کا غلغلہ ہوا - ان اداروں کے سربراہوں اور اساتذہ کی دوران ملازمت تربیت (In-service training) پر خاص توجہ دی جانے لگی اور اسی مقصد کے پیش نظر مرکز توسیع تعلیم (Education Extension Centre) کا قیام عمل میں لایا گیا - لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود نتائج آمید افزا نہیں نکلے - مضامین تدریس کے موضوعات وہی رہے جو عام ثانوی مدارس میں پڑھائے جاتے تھے - وہی جامد نصاب ، وہی درسی کتابیں ، وہی

اساتذہ، وہی طرز تدریس، وہی طریقۂ امتحانات۔ نہ تحقیق نہ تجسس، نہ آپج نہ انفرادیت۔ تیز رفتار اور سست رفتار بچوں کے مسائل جوں کے توں رہے۔ نہ ذہین بچوں کی علمی و ذہنی تسکین کا سامان، نہ سست فہم طلباء کے لیے معالجاتی تدریس کا انتظام، سبھی کو ایک لاٹھی سے ھانکنے کا دستور برابر جاری رہا۔ فنی رہنائی کا پروگرام کاغذی سطح سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جدید تعلیمی آلات (Modern teaching aids) کے بارے میں استاد کا نظریہ نہ بدلا جا سکا۔ سمعی و بصری معاونات کو بھی پہلے سے بہتر مقام نہ مل سکا۔

چونکہ یہ ادارے بھی ھماری تمناؤں کے صحیح مظہر اور ھمارے عزائم کے صحیح ترجمان ثابت نہ ھوئے، اس لیے تیسرے منصوبے میں جامع مدارس (Comprehensive schools) کا خاکہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کا مقصد مثالی طرز کے ثانوی مدارس کھولنا تھا جو پائلٹ اسکولوں کی طرح کثیر المقاصد (Multi-purposes) ھوں، لیکن تعلیمی سہولتوں اور تدریسی مراعات میں ان سے بہتر ھوں۔ جامع مدارس کے منصوبے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ثانوی تعلیم کو جدید اور بہتر انداز میں پیش کیا جائے۔ معیار تعلیم بلند ھو، تدریس مؤثر ھو، تحقیق و جستجو کے ذریعے نصاب میں خوشگوار تبدیلیاں کی جائیں، نفس مضمون کو جدید انکشافات اور علمی گہرائیوں سے ھم آھنگ کیا جائے، نئے نئے طریقہ ھائے تعلیم آزمائے جائیں اور تدریس کے لیے ایسا خوشگوار ماحول اور جمہوری فضا مہیا کی جائے کہ نونہالان قوم اپنی اپنی استعداد، صلاحیت اور رفتار کے مطابق بہتر سے بہتر تعلیم حاصل کر سکیں۔

یہ دور سائنسی ترقی کا دور ھے، ایجادات اور انکشافات کا زمانہ ھے۔ آج سیاسی اور اقتصادی دوڑ میں بازی اسی قوم کے ھاتھ رھے گی جو ملک کے مختلف اقتصادی شعبوں میں سائنسی معلومات اور جدید فنی تدابیر کو کام میں لائے گی۔ آج لکڑی کا ھل ٹریکٹر کے سامنے عاجز ھے، بیل گاڑی ٹرک کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ ایٹمی توانائی کا دور ھے، خلائی پروازوں کا زمانہ ھے۔ روس کا اسپتنک (Sputnik)

آگے نکلتا ہے تو امریکہ کے سائنسی اور تعلیمی حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے، سائنسی پسماندگی کی ساری ذمہ داری ثانوی مدارس کے ریاضی اور سائنس کے نصاب پر ڈال دی جاتی ہے۔ سائنس دانوں، ماہرین تعلیم اور ثانوی مدارس کے متعلقہ اساتذہ کے بورڈ قائم ہو جاتے ہیں، نصاب کی جراحی بعد از مرگ (Post-mortem) ہوتی ہے، پرانی اور حقائق سے بعید بحثیں نکال باہر کی جاتی ہیں۔ نئی تحقیقات سے حاصل کیا ہوا جدید علم ان کی جگہ پاتا ہے۔ نیا نصاب تجرباتی طور پر چند مدرسوں میں رائج ہوتا ہے، ان کی تدریس میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں ان کا مناسب حل تلاش کیا جاتا ہے۔ نئی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ان کے تجرباتی ایڈیشن منتخب مدارس میں پرانی درسی کتابوں کی جگہ لیتے ہیں۔ موسم گرما کی تعطیلات میں منتخب اساتذہ کو ان کی تدریس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ تجرباتی مدارس کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے اور کئی سال کی محنت، تحقیق اور تجربہ کے بعد کتابوں کو آخری شکل ملتی ہے، اور ملک بھر کے ثانوی مدارس کو اس نئے پروگرام میں شمولیت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ثانوی مدارس میں ریاضی، طبیعیات، کیمیا، نباتیات وغیرہ کے نئے نصاب کے نفاذ سے قوم میں ایک نئی توانائی آ جاتی ہے، اور سائنس دان ایک حوصلہ مندانہ عزم کے ساتھ صنعتی ترقی اور خلائی پروازوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔

ہمارے یہاں جامع مدارس کے قیام کا تصور، اصلاح نصاب کا شدید احساس، سائنسی مضامین کی ترقی کی تمنا اور طریقہ ہائے تعلیم میں انقلاب برپا کرنے کی خواہش، سب اسی اسپتنک قسم کے جذبے کا مظہر ہیں۔ پاکستان کی روز افزوں صنعتی ترقی، کاریگروں اور مزدوروں کی بڑھتی ہوئی مانگ اور ان پڑھ اور فن ناشناس کارکنوں کی بے کاری، سب اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم اپنے ثانوی مدارس کی تعلیم کو صحیح اور واضح خطوط پر چلائیں اور ایک نئی ظاہری و معنوی شکل عطا کریں۔ ثانوی مدارس کی تشکیل نو ایک احساس ہے جسے حساس دلوں نے جنم دیا ہے، ایک تحریک ہے جس میں ایسا تعلیمی نظام قائم کرنے کی دعوت پنہاں ہے جو ہمارے جدید ملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، ایک پروگرام

ہے جو ملک کو اقتصادی لحاظ سے خود کفیل بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل کیا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہماری منزل کیا ہے؟ کیا جامع مدرسہ ہماری بیماریوں کا مداوا ہے؟ جامع مدرسہ کیا ہے؟ اس سے ہم کیا مراد لیتے ہیں؟ آئیے اب اس کی چند جھلکیاں دیکھیں۔

ثانوی تعلیم کا یہ ادارہ اپنے مقاصد کے اعتبار سے ہمہ گیر نوعیت کا حامل ہے۔ آپ اسے جامع بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ اپنی ذات میں ایک جامع پروگرام، جامع نصاب، جامع طریقۂ تعلیم اور جامع تعلیمی سرگرمیوں کا حامل ہے۔ اس کی عمارت جامع ہے، اس کا کتب خانہ بھی جامع ہے، اس کی تجربہ گاہیں، ورکشاپیں، کھیل کے میدان غرض اس کی جملہ تعلیمی سہولتیں جامعیت کی مظہر ہیں۔ یہی جامعیت اس مدرسے کی انفرادیت ہے، اور یہی اس کا امتیازی نشان۔

اس ادارے کا مقصد ایسے بچوں کی دریافت اور ان کی خداداد صلاحیتوں کو مزید جلا دینا ہے جو نابغۂ روزگار (Highly gifted) ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا مقصد ایسے بچوں کی تربیت کا معقول انتظام کرنا بھی ہے جو ذہنی لحاظ سے پہلی قسم کے بچوں سے بہت پیچھے (Retarted) ہوں۔ بچوں کے انفرادی اختلافات (Individual differences) کا احترام جامع مدرسہ کا بنیادی اصول ہے۔ بچے مختلف ہوتے ہیں، شکل و صورت میں، مزاج و آہنگ میں، ذہنی استعداد میں، قوت کار میں، وراثت میں، تجربات اور خواہشات میں۔ اگرچہ وہ ایک ہی درسگاہ میں پڑھتے ہیں، ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں، لیکن ایک دوسرے سے مختلف اپنے ماحول کے نمائندے ہیں اس لیے سب کے واسطے ایک طریقہ تعلیم، یکساں رفتار اور ایک نصاب موزوں نہیں۔ ان کے حالات جدا جدا ہیں، ان کے مسائل الگ الگ ہیں۔ یہ سب اختلافات متقاضی ہیں انفرادی توجہ کے۔ ان اختلافات کی خلیج کو پاٹا نہیں جا سکتا اور نہ ایسا اقدام مفید ہی ہے۔ یہ اختلافات قائم رہنے چاہئیں، اور انہی اختلافات کے جلو میں یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ان انفرادی اختلافات کی صحیح نشاندھی کے لیے اور بچوں کی دلچسپیوں ، علمی صلاحیتوں اور جذباتی توازن کے تجزیے کے لیے اور پھر اس تجزیے کی روشنی میں ان کی صحیح تدریسی و فنی رھنمائی کے لیے جامع مدرسے میں ''مشاورت و رھنمائی،، (Counselling and guidance) کا جامع پروگرام ھوتا ھے - ھر تین سو طلباء کی رھنمائی کے لیے ایک ''رھنما استاد،، مقرر ھے جس کا کام ان طلباء کو دیکھنا ، ان کے اطوار اور طرز عمل کا مشاھدہ کرنا اور ان کے رجحانات کے مطابق صحیح رھنمائی بہم پہنچانا ھے - یہ رھنمائی محض مضامین کے انتخاب تک ھی محدود نہیں بلکہ شخصیت کی مکمل نشو و نما کے لیے راھیں ھموار کرنا اس کا بنیادی فرض ھے -

ذرا اس مدرسہ کا نصاب تو دیکھیے! توازن اس عمارت کی خشت اول ھے - بعض مضامین سب کے لیے لازم ھیں کہ ان کی تعلیم قومی اور ملی نقطۂ نظر سے ھر فرد کے لیے ضروری ھے اور پھر فرد کی ذاتی نشو و نما اور اس کی شخصی بالیدگی بھی ان مضامین کی مرھون منت ھے - اپنی زبان کی تعلیم ، بولنے ، پڑھنے ، لکھنے اور سوچنے کی مہارتیں ، زبانی اور تحریری اظہار کی اھلیت ، اسلامی اور جمہوری اقدار کی تہذیب و تربیت ، قومی تمدن پر فخر اور حب وطن کے احیاء و بقا کا جذبہ ، صحت و ورزش جسمانی ، یہ سب ایسے موضوعات ھیں جن کی تدریس و تحصیل ھر بچے کے لیے لازم ھے ، لیکن ان کے معیار تحصیل میں فرق مراتب کو برقرار رکھا گیا ھے - ھر مہارت کے مدارج ھیں اور یہ مدارج فرد کی صلاحیت اور ذھنی قابلیت کے مطابق متعین ھوتے ھیں تاکہ کوئی بچہ مایوسی اور احساس کمتری کا شکار نہ ھونے پائے - ان لازمی مضامین اور مہارتوں کے ساتھ ساتھ ایک کثیر تعداد انتخابی مضامین کی ھے - یہ مضامین علمی بھی ھیں اور فنی بھی - کسی میں ذھنی ورزش درکار ھے تو کسی میں جسمانی اور بہت سے مضامین میں دونوں - تکنیکی مضامین کے انتخاب میں مقامی اور علاقائی صنعتوں کو بھی خاصا دخل ھے - طلباء کو انتخابی مضامین کی ایک طویل فہرست سے اپنے مزاج اور دلچسپی کے مطابق چند مضمون لینے پڑتے ھیں - انہیں حق حاصل ھے کہ علمی مضامین میں دسترس بہم پہنچائیں یا فنی اور تکنیکی مضامین میں ، یا دونوں شعبوں

میں طبع آزمائی کرتے رہیں اور پھر کسی ایک کے ہو رہیں - علمی اور فنی ہر دو شعبہ ہائے تعلیم کا معیار اس قدر بلند ہے کہ طلباء ثانوی مدارس سے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ممتاز جگہ پاتے ہیں اور صنعتی و فنی ادارے بھی ان کا خیر مقدم کرتے ہیں -

وہ نصابی مشاغل جو کبھی خارج از نصاب فعالیتوں (Extra curri-cular activities) کے نام سے موسوم تھے اور اب ، نصابی مشاغل (Co-curricular activities) کے نام سے مشہور ہیں ، یہاں عین نصاب سمجھے جاتے ہیں - طلباء کی انجمنیں ، کھیل کود ، علمی مباحثے ، جسمانی مقابلے اور اس قسم کی دوسری ذہنی اور جسمانی فعالیتیں مسلمہ افادیت کی حامل ہیں اور سیرت (Character) کی نشو و نما میں ان کا بھرپور حصہ ہے - ان میں شرکت بقدر شوق ہونی چاہیے ، از روئے جبر نہیں - جامع مدرسہ معاشرے کا ایک اہم حصہ ہے - معاشرہ اس کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتا ہے اور یہ معاشرے کی سرگرمیوں میں - اس باہمی سمجھوتے اور ارتباط سے ایسی سرگرمیوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے -

شہر کے پڑھے لکھے لوگ ، مختلف شعبوں کے سربراہ اور ماہرین خصوصی ہمارے معاون اور مشیر ہیں - وہ ہماری دعوت پر درسگاہ میں آتے ہیں اور اپنے تجربات سے طلباء کو فیض حاصل کرنے کا موقع دیتے ہیں - اس طرح ہمارے نصاب کو ایسی وسعت اور گہرائی نصیب ہوتی ہے جو دوسرے ذرائع سے ممکن نہیں - درسی کتابیں موجود ہیں لیکن محض ایک تدبیر اور آلے (Aid) کی حیثیت سے - درسی کتاب تعلیم کا منتہائے مقصود نہیں ، چراغ راہ ہے جو علم کی نئی راہیں سجھاتی ہے اور مزید مطالعہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے - مدرسے کا کتب خانہ نصاب کو مزید وسعت عطا کرتا ہے ، طلباء کے مذاق سلیم کو تربیت دیتا ہے اور ان کا معیار تعلیم بلند کرتا ہے - یہاں ہر شعبے ، ہر درجے اور ہر ذوق کے طلباء کے لیے پڑھنے کا مواد موجود ہے اور طلباء کو اس مواد تک پوری رسائی حاصل ہے - پرسکون ماحول ، رہنما استاد ، دلچسپ مواد مطالعہ — یہ سب کچھ میسر ہو تو علم کی عمارت درسی کتاب کی سطحی بنیادوں کی بجائے تحقیق و تجسس کی ٹھوس اساس پر اٹھنے لگتی ہے -

اس درسگاہ کے طریقہ ہائے تعلیم جمود نا آشنا ہیں۔ بچے کے ذاتی تجربات اور مشاہدات تدریس کے لیے بنیاد کا حکم رکھتے ہیں ۔ طریق تدریس میں نئے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں ۔ بحث ، تبادلۂ خیالات ، گروہ بندی (Grouping) ، اجتماعی تدریس ، انفرادی تدریس ، تفویضی طریقہ (Assignment method) ، تعلیم بالاشتراک (Learning by participation) وغیرہ موقع اور محل کے مطابق سبھی طریقے اپنائے جاتے ہیں ۔ سمعی اور بصری معاونات بھی یہاں بے حد مقبول ہیں ۔ ان میں بہت سے معاونات ہمارے اساتذہ کے خود ساختہ ہیں ۔ چارٹ ، نقشے ، گلوب ، گراف اور ماڈل یہ سب چیزیں ہماری اپنی ورکشاپوں اور تجربہ گاھوں کی پیداوار ہیں ۔

اس مدرسے کے سربراہ اور اساتذہ سے ملیے تو جی خوش ہو جاتا ہے ۔ متبسم چہرے ، پیشانی پر ذہانت اور تجربے کے آثار نمایاں ۔ ہر شخص اپنے فن کا استاد بھی ہے اور طالب علم بھی ۔ اگرچہ یہاں مختلف مضامین کے شعبے قائم ہیں لیکن ان میں سے کوئی شعبہ بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا قائل نہیں ۔ سارا عمل تدریس ان کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا مظہر ہے اور پھر یہ تعاون مدرسے کی چہار دیواری تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے ڈانڈے ماحول سے ملے ہوئے ہیں ۔ والدین ، شہریوں اور تعلیمی اکابر اور اداروں کے ساتھ تعاون اور اشتراک ، اس مدرسے میں اندر سے ابھرتا ہے ، باہر سے نہیں تھوپا جاتا ۔

مدرسے کا نظم و ضبط دیکھیے تو ضبط کے قدیم اور فرسودہ نظریات کو بھول جائیے ۔ یہ ضبط آج کے آزاد معاشرے کے ملی اور اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے ، اس کی جڑیں جمہوریت کی زمین میں پھیلتی ہیں اور اس کی شاخیں فضائے حریت میں پروان چڑھتی ہیں ۔ یہ آئین ضبط نہ اوپر سے آیا ہے اور نہ یہاں کے سربراہ کے ذہن و قلم کا کرشمہ ہے بلکہ یہ تخلیق ہے مختلف اذہان کے باہمی اشتراک کی ۔ اس کی تشکیل میں صدر مدرسہ ، استاد ، طالب علم ، والدین اور شہری سبھی کو دخل ہے ۔ اسی لیے یہ آئین مؤثر ہے ، قابل عمل ہے ، یہ تعلیم کے لیے آب حیات

اور جمود و بے راہ روی کے لیے سم قاتل ہے ، اور اس آئین کی پاسداری ہم سب کا مقدس فرض ۔

یہ فرضی مدرسہ جس کی ایک سرسری سی جھلک ان سطور میں پیش کی گئی ہے ہماری آرزوؤں کا گلدستہ اور ہماری تمناؤں کا چراغ ہے ۔ آئیے ، ہم ایسے بہت سے گلدستے معاشرے کے طاقوں میں سجائیں کہ ان کی بوباس سے ذہن معطر ہو جائیں ۔ آئیے ، ایسے بہت سے چراغ روشن کریں کہ ان کے نور سے جہالت اور افلاس کے اندھیرے چھٹ جائیں ۔

---

محمود پرنٹنگ پریس لمیٹڈ
56 - این گلبرگ 2 ، لاہور